© rasailojaraid.com

تحقیق وتنقید

امام ابن تیمیہؒ اور مطالعۂ تاریخِ اسلامی

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

فاضل مقالہ نگار میرے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں امام ابن تیمیہؒ کے حوالے سے اسلامی تاریخ کے دورِ اوّل سے متعلق بہت سی باتیں کہی ہیں۔ ان سے اتفاق بھی کیا جاسکتا ہے اور اختلاف کی بھی گنجائش ہے۔ راقم کو بھی ہر بات سے اتفاق نہیں ہے۔ دو ایک نکات پر حواشی میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس موضوع پر اب اتنا موافق و مخالف مواد ہماری زبان میں آچکا ہے کہ آدمی اس کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کرکے رائے قائم کرسکتا ہے۔ پھر بھی کچھ گوشے تحقیق طلب ضرور ہوں گے۔ اسلامی تاریخ اور سیرت کے علماء و ماہرین سے درخواست ہے کہ وہ ان پر سنجیدہ اور علمی انداز میں اظہار خیال فرمائیں۔ اس سے امید ہے صحیح نتیجہ تک پہونچنے میں مدد ملے گی۔ (جلال الدین)

اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور نگارش دونوں صحیح زاویۂ نگاہ اور منصفانہ فکر و نظر کے محتاج ہیں اور غالباً اتنے ناگزیر طور سے کہ ان کے فقدان کی صورت میں بسا اوقات ایمان و عقیدہ پر کاری ضرب پڑتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امت اسلامیہ نے تاریخ و سیرت کا اتنا بڑا ذخیرہ فراہم کردیا ہے کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے لیکن اس کے ساتھ یہ اس کی بدقسمتی رہی ہے کہ اس کے عظیم الشان پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیم، جلیل القدر صحابۂ کرام رضوان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ علیہم اجمعین اور خلفاء عظام رحمہم اللہ کی سیرت و تاریخ کی ترتیب و تدوین، تحریر و تبویب اور تعلیم و تدریس میں صحتِ مواد اور تہذیب نگارش کا اصول اکثر و بیشتر ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ کچھ تو اس میں ہمارے جامعینِ روایات اور ناقلینِ اخبار کے حرصِ استیعاب و استقصاء کا دخل ہے اور کچھ اسلامی مورخین کے غیر تنقیدی شعور اور جامعیت کے وسیع پس منظر سے عاری اندازِ فکر و نظر کا، باقی رہی سہی کسر اسلام دشمن عناصر کی ہوسِ دراندازی اور طمعِ خام نے پوری کردی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے ابتدائی مآخذِ سیرت اور بنیادی مصادرِ تاریخ "مجموعۂ خیر و شر" اور "دفترِ رطب و یابس" بن کر رہ گئے ہیں۔ ان کی بنیاد پر جو کتابیں بلا تنقید و تجزیہ اور بلا تحلیل و تہذیب لکھی گئیں ان کی مثال اس دیوار کی مانند ہے جس کی بنیاد خشتِ اول کی کجی پر رکھی گئی ہے۔ بلاشبہ تاریخ اسلامی کا ہمارا مطالعہ مختلف قسم کے فکری تعصبات پہلے سے سوچے سمجھے رجحانات اور مسلکی اور گروہی میلانات کا زائدہ بھی ہے اور پروردہ بھی اور اس کا حقیقت سے ذرا کم ہی واسطہ ہے۔ بالخصوص عہد فتنہ کے آغاز سے بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ سے خلافت اموی کے اختتام تک ہمارے اپنے نقطۂ نظر اور شیعی / سبائی یا خارجی زاویۂ نگاہ میں بہت معمولی فرق ہے اور اکثر یہ فرق بھی معدوم ہوجاتا ہے[۱]۔ ہمارے کئی مفکروں، عالموں اور مورخوں نے اسلامی تاریخ کی ان خامیوں کا احساس کرکے اپنے اپنے زمانوں میں انھیں دور کرنے اور عوام الناس بلکہ تاریخ سے ناواقف خواص اور علماء میں بھی اس معاملہ میں جو گمراہی اور فکری بے راہ روی پیدا ہوچلی تھی۔ اسے[۲] دور کرنے کی کوشش کی تھی[۳]۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ (۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ / ۲۲ جنوری ۱۲۶۳ء تا ۲۰ ذوالقعدہ ۷۲۸ھ / ۲۶ ستمبر ۱۳۲۸ء) بھی ان معدودے چند مردانِ کار میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے زمانۂ پرآشوب میں اسلامی تاریخ کے سنہری عہد سے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور ان مسخ شدہ ابواب کو ازسرِ نو روشن کیا جو مدتوں سے غیر اسلامی اور غیر تاریخی عناصر کے ہاتھوں مسخ ہو رہے تھے۔ امام احمد بن تیمیہ نے اسلامی تاریخ، صحابہ کرام اور خلفائے رسول انام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اپنی متعدد تصانیف میں کیا ہے۔ یہاں یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ علامہ موصوف اگرچہ مورخ نہیں تھے اور نہ ہی انھوں نے اسلامی تاریخ پر کوئی مستقل تصنیف چھوڑی ہے۔ تاہم انھوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اپنے وسیع وعمیق، جامع وشامل اور دور رس مطالعہ اور حقیقت آشنا فکر ونظر کی بنیاد پر اسلامی تاریخ کا مطالعہ اس کے وسیع تناظر میں کیا ہے اور پھر قرآن وحدیث، تاریخ وکلام اور دوسرے اسلامی علوم سے بھرپور استفادہ واستدلال کر کے اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار، خلفاء کرام اور شخصیات پر بھرپور لکھا ہے۔ امام موصوف کی تصانیف کو موٹے طور سے دو بنیادی خانوں میں رکھا جا سکتا ہے: ایک وہ مجموعۂ کتب اور ذخیرہ رسائل ہے جو الزامی یا جوابی نوعیت رکھتا ہے اور جس میں شیخ الاسلام نے اسلامی تاریخ کے مسخ شدہ ابواب کی تاریکی کو دور کیا ہے۔ غیروں اور اپنوں کے مطاعن والزامات کا جواب دیا ہے اور خلفاء کرام، صحابہ عظام اور شخصیاتِ اسلام کی سیرت وکردار پر کیچڑ اچھالنے کی کوششوں کو بے نقاب کرتے ہوئے ان کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔ ہمارے بعض مفکرین اسلام اور جلیل القدر علمائے کرام نے جن کی عظیم اسلامی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس مجموعۂ علم وفضل اور ذخیرۂ رشد وہدایت کو "وکیل صفائی" کی فرد و مثل کہہ کر مسترد کر دیا ہے[۳۵] ● حالانکہ اس

● اس جگہ محترم مقالہ نگار نے مولانا مودودیؒ کا حوالہ دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں مولانا مرحوم کی رائے ان ہی کے الفاظ میں نقل کر دی جائے تاکہ ان کا نقطۂ نظر واضح ہو جائے۔ اپنی کتاب "خلافت وملوکیت" کے مآخذ سے بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

"میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے قاضی ابوبکر ابن العربی کی العواصم من القواصم، امام ابن تیمیہؒ کی منہاج السنۃ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی تحفۂ اثنا عشریہ پر انحصار کیوں نہ کیا۔ میں ان بزرگوں کا نہایت عقیدت مند ہوں اور یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی نہیں آئی کہ یہ لوگ اپنی دیانت وامانت اور صحتِ تحقیق کے لحاظ سے قابل اعتماد نہیں ہیں۔ لیکن جس وجہ سے اس مسئلے میں میں نے ان پر انحصار کرنے کے بجائے براہ راست اصل مآخذ سے خود تحقیق کرنے اور اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اختیار کیا وہ یہ ہے کہ ان تینوں حضرات نے دراصل اپنی کتابیں تاریخ کی حیثیت سے بیان واقعات کے لیے نہیں بلکہ شیعوں کے شدید الزامات اور ان کی افراط وتفریط کے رد میں لکھی ہیں، جس کی وجہ سے عملاً ان کی حیثیت وکیل صفائی کی سی ہو گئی ہے اور وکالت، خواہ وہ الزام کی ہو یا صفائی کی، اس کی عین فطرت یہ ہوتی ہے کہ اس میں آدمی اُسی مواد کی طرف رجوع کرتا ہے جس سے اس کا مقدمہ مضبوط ہوتا ہو اور اس مواد کو نظر انداز کر دیتا ہے جس سے اس کا مقدمہ کمزور ہو جائے خصوصیت کے ساتھ اس معاملہ میں قاضی ابوبکر تو حد سے تجاوز کر گئے ہیں جس =

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی خوبی یہ ہے اور اس لحاظ سے وہ بڑی قدر وقیمت کا حامل ہے کہ وہ ہمارے بعض بزرگوں پر مطاعن کا جواب فراہم کرتا ہے۔ اس طرح کی جوابی تحریروں کو رد کر دیا جائے تو ہماری تاریخ بلکہ دوسرے علوم وفنون کا کافی بڑا ذخیرہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ بہر حال اس نوعیت کی ایک اہم ترین کتاب منہاج السنۃ النبویہ ہے۔ علامہ موصوف کی تصنیف وتالیف کا خالص مثبت نقطۂ نظر ان کے دوسرے مجموعۂ کتب ورسائل میں بھی پایا جاتا ہے جس کا نمائندہ ان کا مجموعۂ فتاوی ہے۔[ع]

منہاج السنۃ النبویہ دراصل ایک اہم شیعی عالم ابن مطہر حلّی (م ۷۲۶-۶۴۸ھ) کی مشہور کتاب منہاج الکرامہ فی معرفۃ الامامہ کے ردّ وجواب میں لکھی گئی ہے اس لیے ہمارے بعض علمی حلقوں میں اس کو الزامی جواب کا طعنہ دے کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ اسلامی تاریخی ادب میں اس کی حیثیت تہذیب وتنقیح کی ہے۔ حافظ ابو عبداللہ محمد بن عثمان ذہبی (م ۷۴۸-۶۷۳ھ) نے اس کی تلخیص المنتقیٰ من منہاج الاعتدال کے عنوان سے کی ہے اور اس میں قدرے مثبت نقطۂ نگاہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔[۵] یہ دونوں کتابیں بنیادی طور سے مسلکِ اہل سنت اور ان کے عقیدہ ونظریۂ تاریخ اسلامی کی نمائندگی کرتی ہیں اگرچہ امام موصوف یا ان کے شاگرد رشید حافظ ذہبی کے بعض خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے یا ان پر مزید اضافہ وتہذیب کا عمل کیا جا سکتا ہے۔ شیخ الاسلام کے ان خیالات وافکار کی قدر وقیمت اور بڑھ جاتی ہے اور ان کے مثبت پہلو رکھنے کا مزید یقین آجاتا ہے جب ہم یہ ملاحظہ کرتے ہیں کہ یہی خیالات زیادہ صراحت اور وضاحت کے ساتھ اور بلا کسی الزامی یا منفی آہنگ کے ان کے مجموعۂ فتاوی میں نظر آتے ہیں۔ اس مختصر مضمون کی بنیاد دراصل انھیں تینوں کتابوں پر رکھی گئی ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہمیں سر دست امام ابن تیمیہ

= سے کوئی ایسا شخص اچھا اثر نہیں لے سکتا جس نے خود بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہو۔ اس لیے میں نے ان کو چھوڑ کر اصل تاریخی کتابوں سے واقعات معلوم کیے ہیں اور ان کو مرتب کر کے اپنے زیر بحث موضوع سے نتائج خود اخذ کیے ہیں۔" خلافت وملوکیت ص ۲۹۵-۲۹۶ طبع ہفتم مرکزی مکتبہ اسلامی۔ دہلی ۶ ۱۹۸۸ء

اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے ان کتابوں کو مسترد نہیں کیا ہے۔ البتہ ان کی مخصوص نوعیت کی بنا پر وہ یہ بات صحیح نہیں سمجھتے کہ ان پر انحصار کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے اصل ماخذ کی طرف رجوع کیا ہے اور اس سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ (جلال الدین)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ان تاریخی افکار و رجحانات سے بحث کرنی ہے جو اسلامی تاریخ کی پہلی صدی بالخصوص عہد زرّیں سے متعلق ہیں۔ بقیہ کتابوں اور ماخذوں کو خواہ وہ ابتدائی ہوں یا ثانوی تائید و تنقید کی غرض سے نقل کیا گیا ہے۔

خلافتِ اسلامی کے آغاز و مراحل، خلفائے کرام کے انتخاب و مقام اور اسلامی عہد کے پہلے پچاس سال کے اہم مراحل کے بارے میں صحابۂ کرام کے طرزِ عمل اور اسلامی حکومت کی نوعیت سے متعلق چند مسائل نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اتنی اہمیت و شدت اختیار کی کہ امتِ مسلمہ سیاسی گروہوں میں اس طرح منقسم ہوئی کہ وہ رفتہ رفتہ مذہبی فرقے بن گئے اور انھوں نے نہ صرف سیاسی مسلک اختیار کیے، بلکہ ان کو مذہبی عقائد کا رنگ دے دیا۔ ان میں دو اہم اور بڑی حد تک متضاد و متحارب نظریات رکھنے والے دو طبقے شیعہ اور خوارج ہیں۔ ان کے مذہبی عقائد کی مانند ان کے تاریخی مسلک بھی افراط و تفریط، کج فہمی اور کج بحثی کا شکار ہیں اور وہ عام طور سے نامقبول سمجھے جاتے ہیں[۶]۔ طرفہ ستم یہ ہے کہ ان تاریخ نوردوں کے خیالاتِ فاسدہ کا اثر بدا در عکسِ قبیح اہلسنت کے بہت سے مفکرین، علماء اور دانشوروں کے تاریخی زاویۂ نگاہ کو کج کر گیا ہے اور ان میں سے کئی ایک ان کے مسخ کردہ عناصر کا شکار ہو گئے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے سب سے پہلے خلافت کے معنی و مفہوم کو قرآن کریم اور حدیثِ نبوی کی روشنی میں متعین کیا ہے اور لغت و ادب سے بھی اس کی تائید و تصدیق فراہم کی ہے۔ امام موصوف نے خلیفہ کا مفہوم لغوی یہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنے پیشرو کا جانشین و نائب ہوتا ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے کہ وہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے جانشین و خلیفہ اور اس حیثیت سے اسلامی امت کے سربراہ و حکمراں بنے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافتِ رسول تو دراصل دائمی یا مستقل تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منظر سے اٹھ جانے کے بعد وجود میں آئی تھی۔ امام ابن تیمیہ نے اپنی تعریفِ خلافت و خلیفہ کے ضمن میں ان مختلف و متعدد خلفاءِ رسول اور جانشینانِ نبی کا ذکر بھی بطور مثال کیا ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزِ اسلام مدینۂ منورہ سے عارضی غیر حاضری اور غیبت کے دوران بطور جانشین و نائب رسول اسلامی امت کی دیکھ بھال اور سربراہی کرتے تھے۔ امام موصوف نے بعض لوگوں کے اس خیال پر شدید تنقید کی ہے کہ خلیفہ سے مراد نائب الٰہی اور خلافت سے مراد خلافت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الٰہی ہے۔ ان کے نزدیک یہ نقطۂ نظر سراسر غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اپنے اس نظریہ کی تائید میں مفصل بحث کی ہے اور مختلف نقلی اور عقلی دلائل دیے ہیں۔● ۵۵

● یہ ایک اہم موضوع ہے۔ اس سے متعلق بعض گزارشات ہم یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت آدمؑ اور ان کی تبعیت میں ان کی اولاد کو خلیفہ کہا ہے (البقرہ: ۳۰) سوال پیدا ہوتا ہے وہ کس کے خلیفہ اور جانشین بنائے گئے۔ یہی سوال مسلمانوں کے امام کے بارے میں پیدا ہوتا ہے علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ ایک خیال یہ ہے کہ انسان عمومی معنی میں خلیفۃ اللہ ہے اس لیے مسلمانوں کے امام کو خلیفۃ اللہ کہا جاسکتا ہے لیکن جمہور نے اسے قبول نہیں کیا ہے اور آیت کا مفہوم بھی وہ یہ نہیں لیتے کہ حضرت آدمؑ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے (مقدمہ ص۱۶۶) ہمارے خیال میں یہ دونوں ہی باتیں بحث طلب ہیں کہ آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے اور جمہور کی رائے کیا ہے؟

حضرت آدم کی خلافت کے بارے میں تین رائیں ہمیں ملتی ہیں ایک یہ کہ وہ زمین میں اللہ کے خلیفہ بنائے گئے۔ دوسری یہ کہ حضرت آدم سے پہلے زمین پر جنات آباد تھے۔ ان کی نافرمانی کی وجہ سے انھیں ہٹا کر حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کو آباد کیا گیا۔ اس سلسلے کی تیسری رائے یہ ہے کہ حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد کو خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ ان کی نسل ایک دوسرے کی جانشین ہوتی رہتی ہے۔

امام ابن جریر طبری نے ان تینوں رایوں کا ذکر کیا ہے (تفسیر قدیم ایڈیشن ۱/۱۵۳-۱۵۴) لیکن بالعموم مفسرین نے تیسری رائے کو نظر انداز کردیا ہے البتہ پہلی دو رایوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے پہلی رائے یا وزن محسوس ہوتی ہے اس سے انسانی کی عظمت اور اس زمین پر اس کی صحیح حیثیت واضح ہوتی ہے اس پر اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ خلیفہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کی عدم موجودگی میں اس کی جانشینی کرے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی جگہ یا کسی وقت موجود نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کو خلیفۃ اللہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خلیفہ کے لفظ میں لازماً یہ بات شامل نہیں ہے کہ کسی کی غیر حاضری میں اس کی جانشینی کی جائے دوسری بات یہ کہ جن لوگوں نے حضرت آدمؑ کو خلیفۃ اللہ کہا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے احکام کو نافذ کرنے والے بنائے گئے۔ ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ یہ رائے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے مروی ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ ابن تیمیہ کے خیال میں خلافتِ اسلامی کی دو قسمیں ہیں: اول، خلافتِ نبوت اور دوم خلافتِ ملک۔ اول الذکر کا قائم کرنا واجب و مقصودِ اصلی ہے اور وہ موخر الذکر سے بہرحال افضل ہے[۳۹]۔ خلافتِ نبوت کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی گئی ہے البتہ

= اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا میں ایک جانشین اپنا زمین میں بنانے والا ہوں جو میرے احکام کو میری مخلوق کے درمیان نافذ کرنے میں میرا جانشین ہوگا یہ خلیفہ اور جانشین حضرت آدمؑ ہیں ان کی اولاد میں جو شخص اللہ کی اطاعت اور اس کی مخلوق کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے میں ان کی قائم مقامی کرے وہ بھی خلیفہ ہے۔ لیکن جو لوگ فساد مچائیں گے اور ناحق خون بہائیں گے وہ خلفاء نہ ہوں گے اور حضرت آدمؑ سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوگا (تفسیر ۱/۱۵۴)

امام رازی نے بھی دونوں رائیں نقل کی ہیں۔ پہلی رائے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کی قرآن مجید کی اور آیتوں سے بھی تائید ہوتی ہے (تفسیر ۱/۲۶۵) اس سے ان کا رجحان صاف ظاہر ہوتا ہے۔

علامہ ابوالسعود فرماتے ہیں کہ حضرت آدم اللہ کے خلیفہ ہیں اور ان کی ذریت میں جو خلفاء پیدا ہوئے وہ بھی اس میں آجاتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے اپنا خلیفہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اس کے احکام نافذ کرے اور اس کی مرضی کے مطابق حکومت و سیاست کرے۔ گو اللہ تعالیٰ کو اس کی ہرگز ضرورت نہیں ہے کہ کسی کو خلیفہ بنائے البتہ انسان اس کے محتاج ہیں وہ اپنی عدم استطاعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے براہ راست فیض حاصل نہیں کرسکتے اس لیے اس نے اپنے پیغمبروں کو واسطہ بنایا ہے۔ اس کے بعد گو انھوں نے اس رائے کا بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت آدم اور ان کی پوری ذریت دوسری مخلوقات کے جانشین ہوئے، لیکن اس سے اتنی بات واضح ہے کہ ان کے نزدیک حضرت آدم کے خلیفۃ اللہ ہونے کے تصور میں کوئی عقلی یا شرعی قباحت نہیں ہے۔

ہمارے ایک قدیم مفسر علامہ بغوی فرماتے ہیں۔ والصحیح أنه إنما سمی خلیفة لانه خلیفة الله فی الارض لاقامة حدوده و تنفیذ قضایاه۔ بغوی علی ہامش الخازن ۱/۳۸ (صحیح بات یہ ہے کہ ان کو خلیفہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کے حدود اور اس کے قوانین نافذ کرنے میں اس کے خلیفہ تھے)

یہی عبارت بلفظہ خازن نے اپنی تفسیر میں نقل کرلی ہے (خازن ۱/۳۸) گویا ان کی اسے پوری تائید حاصل ہے۔

جہاں تک آیت کے موقع و محل اور سیاق و سباق کا تعلق ہے وہ اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو 'دین کا قرآنی تصور' از مولانا صدر الدین اصلاحی ص ۲۸۔۲۹ طبع سوم۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متعدد احادیث و آثار سے اس کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنتِ نبوی اور سنتِ خلفاء نبوی سے جو خلافت و حکومت ہم آہنگ ہو وہ خلافتِ نبوت ہے اور حدیث نبوی: علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین (تم پر میری سنت اور ہدایت یافتہ اور متبع شریعت خلفاء کی سنت کی پیروی لازم ہے) کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ایسا واضح طور سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ کے نزدیک خلافتِ نبوت صرف وہی حکومت ہو سکتی ہے جو ایک دوسری حدیث نبوی: خلافۃ النبوۃ ثلاثون سنۃ (خلافتِ نبوت تیس سال رہے گی) کی حد بندی کے اندر محدود ہو۔ ان کی یہ نظریاتی حد بندی حضراتِ خلفاء اربعہ — حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور علی مرتضیٰ — کی تاریخی اور واقعاتی حد بندی سے ہم آہنگ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اور انتخاب صدیقی سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادتِ عظمیٰ پر یہ مدت ختم ہوتی ہے۔ اس لیے دوسرے الفاظ میں حضرت امام کے نزدیک پہلے چار خلفائے رسول کی خلافت خلافتِ نبوت تھی[۹] بعض علمائے کرام نے تیس سالہ خلافت نبوت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کو بھی شامل کیا ہے[۱۰] لیکن یہاں ایک مشکل پیش آتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر مدت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن تیس سالوں کی حد بندی کی تھی ان میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چھ ماہ بھی داخل ہو جاتے ہیں کہ دونوں اپنے اپنے مقبوضات میں عوام و امت کے مشورے اور مرضی سے خلیفہ بنے تھے اور ان دونوں کی خلافت اگرچہ متفقہ نہیں تھی۔ بہر حال بیشتر علماء کی مانند حضرت علیؓ کی شہادت کے ساتھ خلافتِ نبوت کے خاتمہ کا نظریہ امام ابن تیمیہ کے یہاں پایا جاتا ہے۔ امام موصوف نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دلچسپ نظریہ بھی بیان کیا ہے کہ جس خلافت کی بیعت مدینۂ منورہ میں کی گئی ہو وہ خلافت نبوت ہے اور جس کی بیعت شہر رسول سے باہر ہوئی ہو وہ خلافت تو ہو سکتی ہے مگر خلافتِ نبوت نہیں۔ جس طرح قاضی ابو یعلیٰ نے متعدد احادیث نبوی آثارِ صحابہ اور دلائل علمی کی بنیاد پر دوسری بیعتوں کو خلافت ہی تسلیم کیا ہے[۱۱] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نظریہ پر یہ اشکال بھی وارد ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی خلافت بعد کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی دور میں مدینۂ منورہ میں منعقد ہو تو کیا وہ خلافتِ نبوت کے مقام و مرتبہ کی مستحق ہوگی یا اسے بھی حدیثِ نبوی کے مطابق تیس سال بعد از وفات نبوی کی حدود میں محدود کرنا ہوگا۔ علامہ ابن تیمیہ کا عقیدہ ہے کہ خلافتِ نبوت کی مدت کے بعد خلافتِ ملک شروع ہوئی اور وہ ایک مخصوص مدت تک جاری رہی۔ انھوں نے خلافتِ ملک کی کوئی حتمی تحدید و تعیین نہیں کی ہے جس طرح خلافتِ نبوت کی ہے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیر و رحمت کے زمانہ کو مشہور حدیثِ نبوی خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم (زمانوں/قرنوں میں بہترین میرا زمانہ و قرن ہے پھر ان لوگوں کا جو ان کے متصل زمانے میں آئیں اور پھر ان لوگوں کو جو ان کے معًا بعد آئیں) سے محدود و معین کرتے ہیں[۲۱]

خلافتِ نبوت کی تعیین و تحدید کے ضمن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی احادیثِ نبوی کے وسیع ذخیرہ پر گہری نظر، روحِ حدیث اور روحِ اسلام سے کامل واقفیت اور تجزیہ و تحلیل کرنے کی عظیم صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے علماء اور دانشوروں میں یہ مرض عام ہے کہ وہ صرف ایک حدیث نبوی ایک روایتِ راوی اور ایک واقعہ تاریخی کی بنا پر نہ صرف تعمیم کر لیتے ہیں بلکہ اس سے اصول مستنبط کر کے کلیہ قاعدہ بنا لیتے ہیں اور پھر جو شخص ان کے خود ساختہ کلیہ قاعدہ کو نہ ملنے اس کو وہ حدیثِ نبوی کا منکر یا تاریخی واقعہ و روایت سے نابلد قرار دے دیتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ کا یہ کارنامہ ہے کہ وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے تمام پہلوؤں کا بشری بساط بھر جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں، اور موضوع کو اس کے وسیع تر تناظر میں پرکھتے اور سپرد قلم کرتے ہیں۔ چنانچہ خلافت کے موضوع پر انھوں نے تقریباً تمام احادیث نبوی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس پر مکمل بحث تو ایک الگ مضمون کی متقاضی ہے البتہ اس کے ایک جامع اور مختصر حوالہ پر یہاں گفتگو کی جاتی ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اس موضوع پر منہاج السنۃ میں تو منتشر اور مختصر بحث کی ہے تاہم اپنے مجموعۂ فتاویٰ میں بحث مفصل ایک مخصوص فصل میں کی ہے اور بہت سی روایات، احادیث و آثار کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے عام اہلِ سنن سے اور بالخصوص امام احمد اور امام ابوداؤد وغیرہ سے تین مرویات بیان کی ہیں جن میں تیس سال تک خلافت (خلافت نبوت) کے قیام و برقراری کی تحدید پائی جاتی ہے اور اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بعد اس کے ملک میں تبدیل ہو جانے کی تصریح کی گئی ہے مگر یہاں ایک اہم نکتہ یہ یاد رکھنے کا ہے کہ ملک کو بلا صفت بیان کیا گیا ہے اور اسے کسی صفت سے خاص نہیں کیا گیا ہے۔ حضرت امام ابن تیمیہ نے انھیں احادیث نبویہ کی بنا پر خلفاء اربعہ کی خلافت کو خلافتِ نبوت قرار دیا ہے اور ان میں سے کسی بھی بزرگ پر لعن طعن کرنے والے کو بلادلیل بتایا ہے۔ اس کے بعد امام موصوف نے امام مسلم سے ایک اور اہم بلکہ اہم ترین حدیث نبوی نقل کی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پہلے خلافتِ نبوت و رحمت ہوگی پھر ملک و رحمت کا دور ہوگا، پھر ملک و جبریت کا زمانہ آئے گا پھر ملکِ عضوض ہوگا"[۱۳] امام مسلم کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کے چار ادوار بیان فرمائے تھے جبکہ ہمارے یہاں عام طور پر درمیان کے دو ادوار کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہ کی اس تحدید و تعیین زمانۂ خلافت پر مزید گفتگو اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

ہمارا عام تاثر یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں کسی معین شخص کو اپنا خلیفہ نامزد نہیں فرمایا تھا۔ مگر متعدد اصحابِ سنت کا عقیدہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے ثلاثہ کے بارے میں بالخصوص اور خلفائے اربعہ کے بارے میں بالعموم ایسے اشارے اور قرینے ضرور دئے تھے جن سے ان کی خلافت کا اسی ترتیب تاریخی و واقعاتی کے ساتھ منعقد و وقوع پذیر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اس ضمن میں علامہ ابن حزم کی روایت و سند سے اس مسئلہ پر علماء امت کے چار مسالک کا ذکر کیا ہے جن میں سے پہلا یہ ہے کہ کوئی نامزدگی نہیں کی گئی تھی۔ دوسرا یہ کہ حیاتِ نبوی کے آخری تین چار دنوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حکمِ نبوی سے امامتِ نماز کی تھی اور وہ ان کی خلافت یا نامزدگی کی ایک دلیل ہے مگر تیسرا مسلک اس سے اختلاف رکھتا ہے اور وہ ان کی امامتِ نماز کو ان کی افضلیت پر دلیل بتاتا ہے نہ کہ ان کی خلافت پر اور چوتھا مسلک یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی بطورِ خلیفۂ رسولِ اکرم نامزدگی صراحتاً ہوئی تھی۔ امام ابن تیمیہ نے ان میں سے آخری مسلک اختیار کیا ہے اور اس کی تائید میں قرآن کریم، احادیثِ نبوی اور تاریخِ اسلامی سے متعدد دلائل و براہین دئے ہیں[۱۴] یہ ان کی دیانت داری اور علمی شرافت ہے کہ انھوں نے اپنے نظریۂ خلافت کے مخالفین اور عدم استخلاف کے قائلین کے بھی دلائل اسی طرح بیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کئے ہیں۔ امام ابن تیمیہ کے دلائل و براہین کا خلاصہ یہ ہے کہ خلافت صدیقی پر کوئی نص صریح تو نہیں پائی جاتی تاہم بہت سے مضبوط قرائن و شواہد ملتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کی تھی اور "نص جلی سے سکوت اختیار کر کے صرف امت کے اجماع پر اکتفا فرمایا تھا"[۱۵] البتہ وہ بعض اہل سنت کے اس مسلک سے بھی کسی حد تک اتفاق رکھتے ہیں کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نص جلی یا نص خفی کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا ...... بنابریں یہ مسلمہ صداقت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے بعد صرف حضرت ابوبکر ہی کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا"[۱۶]

خلیفہ کی شرعی اور قانونی حیثیت کے بارے میں امام ابن تیمیہ کا خیال ہے کہ "کوئی خلیفہ اپنی رعایا کا مالک و آقا نہیں ہوتا کہ وہ ان سے بالکلیہ بے نیاز ہو جائے۔ وہ رعایا/عوام سے برّ و تقویٰ کے کاموں میں اپنے ساتھ تعاون اور اطاعت و فرماں برداری کا مطالبہ کر سکتا ہے اور ایسے تمام امور و معاملات میں اس کی اطاعت عوام پر واجب بھی ہے۔ اس کی مثال امام نماز کی مانند ہے کہ اگر امام نماز ارکان ٹھیک ادا کرتا ہے تو مقتدی اس کی پیروی کرتے ہیں اور اگر وہ بھول جاتا ہے تو اس کی رہنمائی کر کے اسے راہِ راست پر لاتے ہیں"۔ امام ابن تیمیہ نے خلیفہ کے مقام، حقوق و اختیارات اور امت سے اس کے تعلق کی دلیل حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پہلی تقریر سے پکڑی ہے جو انھوں نے اپنی بیعت کے منعقد ہونے کے بعد مسجد نبوی میں منبر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی۔ خلافت کے انعقاد اور منعقد کرنے والوں کی تعیین کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کا نظریہ یہ ہے کہ "امامت و خلافت کا اصلی مقصود قوت و اقتدار کا حصول ہے لہٰذا جب اصحاب قوت و شوکت کسی شخص کی خلافت پر متفق ہو جائیں تو اس کی خلافت منعقد ہو جائے گی ..... اور ایسا خلیفہ ان اولی الامر میں شمار ہو گا جو واجب الاطاعت ہیں بشرطیکہ اور تاوقتیکہ وہ معصیتِ خداوندی کا حکم صادر نہ کرے"۔ امام موصوف کے اس بیان نیز بعض دوسری تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کے انعقاد کے لیے ان کے نزدیک اہم ترین شرائط تین ہیں: اول مسندِ خلافت پر قبضہ، دوم اس کی خلافت پر اجماعِ امت اور سوم مقاصد خلافت کی تکمیل کرنے کی صلاحیت۔ مسندِ خلافت پر قبضہ کے لیے وہ انتخاب اور شوریٰ کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یقیناً افضل مانتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ بزورِ شمشیر قبضہ کو بھی ناجائز قرار نہیں دیتے۔ اجماعِ امت سے پوری امت کا اجماع مراد نہیں لیتے بلکہ اصحاب قوت و شوکت کی تائید و اتفاق مراد لیتے ہیں اور ہر اس حکومت و خلافت کو اسلامی سمجھتے ہیں جو قوانینِ شریعت کا نفاذ کرے اور کلمہ الٰہی کے اعلاء و سرفرازی کے لیے کوشش کرے[۱۷]

اپنے اس مسلک کے مطابق امام ابنِ تیمیہ خلفاء اربعہ کے مختلف طُرقِ انعقادِ بیعت کو صحیح اسلامی طریقہ قرار دیتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی خلافت پر اجماعِ امت ہوا تھا۔ لیکن اس اجماع کی کیفیت کے بارے میں وہ یہ ضرور فرماتے ہیں کہ خلفائے ثلاثہ کی خلافت و حکومت پر جتنا پختہ، عام اور ہمہ گیر اجماعِ امت تھا وہ خلافتِ چہارم کو حاصل نہ تھا کیونکہ مدینۂ منورہ کے معتدبہ طبقات اور بعض دوسرے صوبوں نے حضرت علی خلیفۂ چہارم کی خلافت تسلیم نہیں کی تھی[۱۸] تقریباً یہی نقطۂ نظر شاہ ولی اللہ دہلوی (رحمۃ اللہ) کا بھی ہے[۱۹] امام ابنِ تیمیہ عام اہلسنت کے مسلک کے مطابق خلفائے اربعہ کی بالترتیب افضلیت کے بھی قائل ہیں اور واقعاتی ترتیب کے مطابق ان کی درجہ بندی کرتے ہیں اور اوپر سے نیچے کی طرف آنے والے زینہ کی مانند ان کی افضلیت کے درجات بتاتے ہیں حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو عام طور سے شیخین قرار دیا جاتا ہے اور امام ابنِ تیمیہ بھی نظریہ اپنا کر مزید اضافہ یہ کرتے ہیں کہ ان کی خلافت کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے کمال و تکمیل کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کے برخلاف اپنے رشتہ داروں کی بجائے اپنے اصحاب کرام کے بہترین افراد کو ایمان و تقویٰ کی افضلیت اور کردار و عمل کی محبوبیت کی بنیاد پر آگے بڑھایا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ امام موصوف اپنے عقیدہ و مسلک کے مطابق خلافتِ صدیقی کو خلافتِ فاروقی پر فضیلت دیتے ہیں اور خلافتِ فاروقی کو خلافتِ عثمانی پر اور خلافتِ عثمانی کو خلافتِ علوی پر[۲۰] اور یہی عام اہل سنت کا مسلک بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان چاروں خلفاء کو خلفائے راشدین مانتے ہیں اور ان کی خلافت کو خلافتِ نبوت۔ اور ان کی خلافتِ نبوت ہونے میں ان کی درجہ بندی اور طور بطور افضلیت سے کوئی اثر اور فرق نہیں پڑتا۔ باہمی فرقِ مراتب کے باوجود ان چاروں خلفاء کی خلافت اصلاً خلافتِ نبوت ہی تھی[۲۱]

حضرات شیخین کی خلافت پر عام اہلسنت کے علاوہ دوسرے اسلامی فرقوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی اتفاق ہے سوائے غالی اور عام شیعہ طبقات کے جو ان کی خلافت کو اسلامی حکومت اور خلافتِ نبوت تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کے علاوہ خلیفۂ سوم کی حکومت کو بھی غاصبانہ اور غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے حضرات شیخین کی خلافتِ نبوت کو نہ صرف مثبت طور سے ثابت کیا ہے بلکہ دلائل نقلی و عقلی کے ساتھ ان پر عائد ہونے والے تمام الزامات و مطاعن کا بھی جواب دیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر اہلسنت کے بعض طبقات و دانشوروں کے عائد کردہ الزامات و مطاعن کی پرزور تردید کی ہے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ خلیفہ سوم بیگانوں اور دشمنوں کے علاوہ اپنوں میں سے بھی بعض لوگوں کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنتے رہے ہیں اور ان الزامات میں اقربا پروری، عمال کے تقرر میں خویش نوازی اور صلاحیت و لیاقت یا خود ساختہ معیارِ تقویٰ و طہارت کے فقدان، اموالِ بیت المال میں بے جا تصرف، قبائلی عصبیت کے سدباب کے بجائے حوصلہ افزائی، طبیعت میں غیر معتدل نرمی اور شیخین یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ سے تجاوز وغیرہ کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں[۴۲]۔ بعض اسلامی مفکرین نے اسلام کے اصول حکمرانی اور تاریخ خلافت اسلامی کی روشنی میں خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے دور خلافت کے نصف دوم کو اسلام میں ملوکیت کا آغاز اور خلافت علی منہاج النبوہ سے دور ہونے کا اولین مرحلہ قرار دیا ہے[۴۳]۔ مگر علامہ ابن تیمیہؒ اسے تسلیم نہیں کرتے وہ حضرت عثمان کی خلافت کو خلافتِ شیخین سے ایک درجہ فروتر ماننے کے باوجود خلافتِ نبوت تسلیم کرتے ہیں جب حکومت کا کاروبار منہاجِ نبوت کے مطابق اسلامی روح سے ہم آہنگ اور قوانین شریعت کے موافق چلایا جاتا تھا۔ انھوں نے حضرت عثمانؓ پر وارد کیے جانے والے تمام اعتراضات کا جواب بڑے جوش و خروش اور تاریخی دلائل کے ساتھ دیا ہے۔ متعدد مطعون عمال عثمانی جیسے حضرات معاویہ بن ابی سفیان، ولید بن عقبہ، عبداللہ بن ابی سرح، مروان بن الحکم، سعید بن العاص اور عبداللہ بن عامر بن کریز پر عائد کردہ الزامات کا نہ صرف جواب دے کر ان کی تقدیس و تطہیر کی ہے بلکہ خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کئی عمال پر وہی الزامات و اعتراضات کے وارد کیے جانے کے امکان کا اظہار کیا ہے کہ مخالفین بطور الزامی جواب کے وہی تمام اعتراضات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وارد کر سکتے ہیں۔[۲۴] اس سے ان کی مراد خلافتِ علوی کو خلافتِ غیر نبوت ثابت کرنا اور الزامات کی تصدیق کرنا نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ عمالِ عثمانی اور خلیفہ سوم اسی طرح ان بیہودہ الزامات سے پاک ہیں جس طرح عمالِ علوی اور خلیفہ چہارم کا دامن ان سے صاف ہے۔ بحث کے آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عثمان کو معصوم نہیں سمجھتے البتہ خلیفہ برحق اور ان کی خلافت کو خلافتِ نبوت سمجھتے ہیں جس طرح ان کے بعد حضرت علی کو خلیفہ برحق اور ان کی خلافت کو خلافتِ نبوت قرار دیتے ہیں۔[۲۵]

خلافتِ نبوت کے خاتمہ کے بعد جس طرز کی حکومت قائم ہوئی اس کی شرعی اور قانونی حیثیت کے بارے میں ہمیشہ سے نرم و گرم بحثیں ہوتی رہی ہیں لیکن موجودہ زمانے میں جو بظاہر اسلامی نشاۃِ ثانیہ کا زمانہ سمجھا جا رہا ہے یہ بحثیں زیادہ تند و تیز ہوگئی ہیں۔ اس ضمن میں تین نظریات پیدا ہو گئے ہیں: اول یہ کہ اموی خلافت اور عباسی خلافت اور بعض دوسری حکومتیں اسلامی تھیں۔ اگرچہ وہ خلافت راشدہ نہ تھیں یا خلافتِ اسلامی کے معیارِ مطلوب اور درجۂ کمال سے گر گئی تھیں تاہم وہ چونکہ اسلامی شریعت کی پابندی کرتی تھیں اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد سیف و قلم بھی جاری رکھے ہوئے تھیں اس لیے وہ بھی خلافت یا اسلامی حکومت ہی تھیں۔[۲۶] دوسرا نظریہ یہ ابھرا ہے اور جس نے موجودہ دور میں زیادہ شدت اختیار کر لی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد ملوکیت قائم ہوگئی تھی جو سراسر غیر اسلامی ہے اور عملاً اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تھا اگرچہ خلیفہ مسلمان، کارندے مومن اور شریعت کی بالادستی کسی حد تک قائم تھی۔ وہ نہ تو خلافت تھی اور نہ اسلامی بلکہ ملوکیت تھی۔[۲۷] تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ ظلم و جور کا دور، شر کے عروج اور خیر کے فقدان کا زمانہ تھا۔ حکومت کا نظام بالکل غیر اسلامی ہوگیا تھا لہٰذا اس کے خلاف بغاوت و خروج لازمی اور اس کا خاتمہ واجب تھا خواہ متبادل حکومت کیسی بھی ہو۔ دوسرے اور تیسرے نظریہ میں تھوڑا سا فرق ہے اور کہیں کہیں وہ معدوم بھی ہو جاتا ہے۔ بعض طبقاتِ امت نے اسی بنا پر حکومت کی تبدیلی کو نہ صرف واجب قرار دیا ہے بلکہ خلافتِ بنی امیہ اور خلافت بنی عباس کے خلاف اٹھنے والی شورشوں کو جائز گردانا ہے یا حکومتِ وقت کے مقابلہ میں ان فتنوں اور انقلابی کوششوں کو اپنی ہمدردی کا مستحق سمجھا ہے۔[۲۸]

امام ابن تیمیہ نے اس ضمن میں حدیثِ نبوی کی متعدد تصریحات کے مطابق حکومت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے چار ادوار قرار دئیے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ خلافتِ نبوت کے بعد ان کے نزدیک جو حکومت کی تبدیلی ہوئی وہ خلافت ہی تھی اگرچہ وہ خلافتِ نبوت نہیں تھی بلکہ خلافتِ ملک تھی۔ اسی لحاظ سے امام موصوف نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کا اولین مَلِک قرار دیا ہے، ان کے لیے خلیفہ کا لقب استعمال کرنے کا جواز فراہم کیا ہے، ان کے عہد کے پہلے سال کو عام جماعت (اتحاد کا سال) قرار دیا ہے اور ان کے دور کو ملک و رحمت کا دور بتایا ہے۔ اور اس کے بعد یہ فتویٰ دیا ہے کہ پہلے چار خلفاء راشدین کے بعد کے حکمرانوں کو بھی خلفاء کہنا جائز ہے خواہ وہ ملوک ہوں اور خلفاء نبوت نہ ہوں۔ اپنے اس خیال کی تائید میں انھوں نے امام بخاری کی بیان کردہ وہ حدیثِ نبوی پیش کی ہے جس میں یہ صراحت آتی ہے کہ بنو اسرائیل کے انبیاء ایک دوسرے کے خلفاء ہوتے تھے مگر چونکہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا لہٰذا میرے بہت سے (کثیر) خلفاء ہوں گے۔ اور تم لوگ ان میں سے الاول فالاول سے بیعت کرنا۔ امام ابن تیمیہ نے اس حدیثِ نبوی کی بنا پر یہ استدلال کیا ہے کہ خلفاء راشدین تعداد کے لحاظ سے "کثیر" نہیں تھے اور چونکہ لسانِ نبوی نے خلفاء راشدین کے بعد کے حکمرانوں کو بھی خلفاء کا لقب دیا ہے اس لیے وہ بھی خلیفہ تھے اور ان کی حکومت خلافت تھی اگرچہ وہ خلافتِ نبوت نہ تھی۔ اسی بنا پر امام موصوف نے حضرت معاویہ کو خلیفہ بھی سمجھا ہے اور ان کے دور کو ملک و رحمت بھی قرار دیا ہے[۲۹]۔ اموی خلافت کو کم از کم ملک و رحمت قرار دینے کے لیے ان کے پاس یہ بھی دلیل ہے کہ ایک اور حدیثِ نبوی میں جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے زبانِ رسالت سے خیر القرون کے تین ادوار قرار دئے گئے ہیں: اولین و بہترین عہدِ نبوی، دوم ان کے بعد کے لوگوں کا اور سوم قرنِ دوم کے لوگوں کے بعد کے لوگوں کا۔ امام موصوف کا عقیدہ ہے کہ کسی بھی اہلِ قرن کا خاتمہ ان کے جمہور کے خاتمہ سے منسلک ہے کیونکہ جمہور ہی اس کا معیار ہوتے ہیں۔ قرنِ اول جمہور صحابہ جو اکابر صحابہ بھی تھے کا زمانہ تھا اور وہ دور خلفاء اربعہ کی خلافت کے خاتمے کے ساتھ ختم ہوا کیونکہ اس کے بعد جمہور صحابہ کرام بالخصوص بدری صحابہ میں سے صرف معدودے چند حضرات زندہ بچے تھے۔ قرنِ دوم اصاغر صحابہ اور جمہور تابعین کا دور تھا جو امارتِ عبداللہ بن زبیر اور امارتِ عبدالملک کے دوران کسی وقت اختتام پذیر ہوا اور قرنِ سوم بقیہ تابعین اور جمہور تبع تابعین کا دور تھا جو دولتِ اموی کے ساتھ یا اس کے اواخر میں ختم ہوا[۳۰]۔ خیر القرون قرنی الخ والی حدیث نبوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی یہ تشریح وتعبیر اور تحدید وتعیین بہت اہمیت رکھتی ہے اور امام صاحب کے مطابق پوری اموی خلافت بشمول خلافتِ یزید اسلامی حکومت قرار پاتی ہے۔ امام ابن تیمیہ کا ایک اور فتویٰ اس تعبیر قرونِ ثلاثہ سے بھی زیادہ اہم ہے اور وہ یہ کہ خلافتِ نبوت میں ملک کی آمیزش سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وہ نہ صرف ہماری شریعت میں جائز ہے بلکہ عدالت کے منافی بھی نہیں لیکن بہر حال خلافتِ نبوت یا خلافتِ محضہ افضل اور مطلوب ومقصودِ اصلی ہے[۳۱] موجودہ عہد کے بعض اسلامی مفکرین اور علماء نے جس طرح خلفاء اربعہ کو راشدین اور بعد کے خلفاء کو غیر راشدین قرار دیا ہے اور ان دونوں کی حکومتوں یا زمانوں کو اسلامی اور غیر اسلامی بتایا ہے وہ امام موصوف کے نظریہ سے نہ صرف متصادم ہے بلکہ حقیقت کے خلاف بھی ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ احادیثِ نبوی کے مجموعی فیصلہ اور وسیع تر حدود سے بھی متحارب ہے کیونکہ خیر القرون کی مدت لغوی اور اصطلاحی طور سے خلفاء اربعہ کی حکومت کے ساتھ نہیں ختم ہو سکتی۔ مزید برآں خلافتِ نبوت اور ملک عضوض کے درمیان خیر کے غلبہ کے دو مزید زمانے تھے، سوم یہ کہ خلفاء کی کثرت کا حوالہ حدیث میں آیا ہے اور چہارم یہ کہ وہ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار تھے جو بہر حال خیر امت تھے۔[۳۲]

فکری، فقہی اور سیاسی اختلاف تو صحابۂ کرام میں ہمیشہ موجود رہا ہے اور وہ علمائے امت کے درمیان ہمیشہ باقی بھی رہے گا مگر یہ اختلاف حدیث و فرمانِ نبوی کے مطابق اختلافِ رحمت ہے جس میں امتِ اسلامی کی وسیع تر اور عظیم تر مصالح مضمر ہیں۔ اسی طرح ایک اور فرمانِ نبوی کے مطابق امت کی صلاح وفلاح اور ہدایت صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی بھی فرد کی اقتدا واتباع سے وابستہ ہے۔ لسانِ نبوی نے صحابۂ کرام میں سے کسی کی بھی اقتداء کے لیے کوئی شرط عائد نہیں کی ہے نہ صحابئ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی صفت یا قید لگاتی ہے اور تیسری اہم بات یہ ہے کہ اہلسنت کے عقیدہ مسلّمہ کے مطابق تمام صحابہ کرام عادل ہیں (الصحابۃ کلھم عدول)[۳۳] یہ صورتِ حال تین خلافتوں کے زمانے میں برقرار رہی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے مسلح تصادم اور مشاجرات کی نوبت آئی۔ یہ صورتِ حال خلافتِ چہارم کے آغاز سے رونما ہوئی اور فرمانِ رسول کے مطابق صحابہ کرام نے اس کو "دورِ فتنہ" اور عہد آزمائش وابتلا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے تعبیر کیا۔ صحابۂ کرام کی اکثریت تو اس دورِ محن میں ارشاداتِ نبوی کے مطابق الگ تھلگ ہو کر اپنے گھروں میں بیٹھ رہی مگر امت کے دو طبقے دو حریف و متحارب گروہوں میں بٹ گئے۔ اور اس دور فتنہ میں جنگ جمل (۳۶ھ) اور جنگِ صفین (۳۷ھ) جیسی دو بڑی خون ریز آزمائشیں برپا ہوئیں[۳۴] امام ابن تیمیہ نے مشاجراتِ صحابہ کے متعلق بڑا متوازن حقیقت پسندانہ اور اسلامی روح سے ہم آہنگ طرزِ فکر اور اندازِ نگارش اختیار کیا ہے جو اکثر علمائے اہلسنت بالخصوص دورِ آخر کے مفکرین کے یہاں مفقود نظر آتا ہے۔

امام صاحب کی رائے ہے کہ وہ تمام حضرات جو اس فتنہ میں مبتلا ہوئے جیسے حضرات عثمان، علی، طلحہ و زبیر اور ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہم وغیرہ اور ان کے متبعین تو وہ سب اہل جنت ہیں کیونکہ حدیثِ صحیح کے مطابق تمام اکابرِ صحابہ بیعتِ رضوان میں شریک رہے تھے جس پر رضائے الٰہی کا وعدۂ قرآنی ہے۔ رہے بعض دوسرے حضرات صحابہ کرام جیسے معاویہ بن ابی سفیان، عمرو بن العاص اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم وغیرہ تو وہ ان جلیل القدر اور اکابرِ صحابہ میں شامل ہیں جن کے بہت سے فضائل و محاسن ہیں اور ان کے بارے میں جو منفی روایات بیان کی جاتی ہیں ان میں سے بیشتر جھوٹ کا پلندہ اور افترا پردازی کا دفتر ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ اپنے سیاسی مسلک میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں اور حدیث نبوی کے مطابق اگر مجتہد صحیح اجتہاد کرے تو وہ دوہرے اجر کا مستحق ہوتا ہے اور اگر نادانستگی میں خطا کاری کا مرتکب ہو جائے تو بھی ایک اجر کا مستحق رہتا ہے اور اس کی خطا معاف ہو جاتی ہے کہ نیت کے لحاظ سے وہ مخلص ہوتا ہے۔ اگر اس کے دوسرے کوئی گناہ ہوں تو وہ توبہ کی وجہ سے معاف ہو جاتے ہیں اور محض گناہ گاری کی بنا پر جہنم میں داخل ہونا لازمی نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا مشاجراتِ صحابۂ کرام کے باب میں سکوت و توقف کرنا بہتر ہے یعنی کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ ان میں سے کسی کے فعل پر ان کی مذمت کرے[۳۵] امام ابن تیمیہ نے دوسرے اہلسنت کی مانند مشاجرات صحابہ کے ضمن میں سکوت و توقف کا جو مسلک اختیار کیا ہے اس کے پیچھے متعدد احادیث نبوی کا الہامی پشتہ لگا ہوا نظر آتا ہے۔ اولین وہ حدیث نبوی ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد مسلمانوں کو اس گناہ سے منع کیا ہے کہ آپ کے اصحاب کرام میں سے کسی کو ہدفِ ملامت بنا لیا جائے اور ان میں سے کسی کے موقف کی آڑ لے کر دوسرے کو طعن و تعریض کا نشانہ بنایا جائے۔ دوم یہ کہ حدیث نبوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے مطابق کسی بھی صحابی کی اقتدا ہدایت و رہنمائی کی ضمانت ہے لہٰذا کسی بھی گروہ یا جماعت کی مذمت نہیں کی جا سکتی اور نہ انھیں خطا کار و غلط کار قرار دیا جا سکتا ہے۔ سوم یہ کہ علمائے اہلسنت کے نزدیک صحابۂ کرام کی عدالت متفقہ اور مسلمہ امر ہے لہٰذا کسی کے فعل کو غیر شرعی، شریعت سے متجاوز اور خطا پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا[۱۱]۔ یہاں اس حقیقت کی طرف بھی توجہ مبذول کرانی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ صواب و خطا کا معیار وہ نہیں جو متاخرین نے متعین کیا ہے۔ اصل معیار وہ ہے جو خود صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن وسنت کی روشنی میں متعین کیا تھا یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت کی ہدایت کی عدم موجودگی میں اجتہاد کا دروازہ کھولا گیا اور مجتہد کو صواب پر دوہرے اجر اور خطا کاری پر اکہرے اجر کا مستحق قرار دیا گیا اور موخر الذکر کو خطا کار بھی نہیں سمجھا گیا۔ پھر صواب و خطا، صحیح و غلط کا پیمانہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے اس کا تصفیہ اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے ورنہ صحابۂ کرام کے ایک گروہ کو ایک طبقۂ فکر خطا کار قرار دیتا ہے تو دوسرا طبقۂ نظر دوسرے گروہ صحابہ کو اور تیسرا طبقۂ علما و مفکرین تیسرے فرقۂ صحابہ کو۔ پھر ان میں سے کون صحیح اور کون غلط ہوگا؟ اس کا فیصلہ کرنا آسان نہیں۔ اس طرح صحابۂ کرام کے تمام گروہ اور تمام طبقات خطا کار قرار پائیں گے اور ان میں سے کسی کی بھی عدالت باقی نہیں رہے گی اس لیے یہ لازمی ہے کہ ان میں سے کسی کو خطا کار کہنے سے گریز کیا جائے۔ حدیث نبوی کہ میرے اصحاب کو ہدفِ ملامت نہ بنانا یہی مفہوم رکھتی ہے۔

مسلمانوں کی پہلی خانہ جنگی — جنگ جمل — کے بارے میں امام ابن تیمیہ مذکورہ بالا اصول و استنباط کی بنا پر تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس وقت صحابۂ کرام کے تین طبقات ہو گئے تھے: اول، صحابۂ کرام کی اکثریت غیر جانبدار ہو گئی تھی کیونکہ وہ اسے فتنہ سمجھتے تھے اور حکم نبوی کے مطابق اپنے گھروں میں بیٹھ رہے تھے۔ دوم وہ صحابۂ کرام جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور سوم وہ صحابۂ عظام جو اتحادِ ثلاثہ — حضراتِ طلحہ و زبیر و عائشہ — کے حامی تھے۔ امام صاحب کی رائے ہے کہ بالکل یہی صورت حال جنگ صفین کی بھی تھی جس میں صحابہ کرام کی اکثریت غیر جانبدار رہی تھی اور ان میں ایک جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی تو دوسری جماعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔ ان دونوں جنگوں میں شامل ہونے والے تمام اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے غیر صحابی شرکاء سب کے سب مسلم و مومن تھے اور وہ دونوں حق پر تھے کیونکہ وہ سب نیک نیتی سے اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے مسلک و موقف کے لیے برسرِ پیکار تھے۔ تمام صحابۂ کرام مطلقاً بہترین مسلمان تھے اگرچہ صحبت و شرفِ نبوی کے اعتبار سے ان میں عموم و خصوص کی نسبت پائی جاتی تھی اور ان کی فضیلت و افضلیت کے درجات تھے اور وہ یوں کہ فتحِ مکہ سے پہلے اسلام لانے والوں کو بعد فتح کے مسلمانوں پر شرف و تفوق حاصل تھا اور ان افضل صحابۂ کرام میں حضرات شیخین سب سے افضل تھے اور ان کے بعد بالترتیب حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما کی فضیلت و شرف کا درجہ تھا۔ اگرچہ حضرات معاویہ اور عمرو بن العاص وغیرہ ان کے ہم پلّہ و ہمسر نہ تھے مگر وہ بھی اکابر صحابہ میں شامل تھے۔ ان کو شرف و فضل بھی حاصل تھا اور ان کی بہت سی خدمات جلیلہ کی بنا پر ان کو صحابۂ کرام کی صف میں خاص امتیاز بھی حاصل تھا۔ مزید برآں سلفِ امت میں سے کسی نے بھی ان کو نفاق سے متہم نہیں کیا کیونکہ حسنِ اتفاق سے تمام مہاجرینِ عظام و اصاغر اس مرض سے بری تھے۔ روایات و احادیث کے مطابق مرضِ نفاق مدینہ کے بعض مقامی طبقات ہی تک محدود رہا تھا اور حضراتِ انصار بھی اس سے منزہ و پاک تھے اسی طرح تمام طلقاء مکہ بھی نفاق سے مبرا اور مخلص مسلمان تھے۔ اگر ان میں سے کسی کے بارے میں بھی نفاق کا شبہ ہوتا تو حضراتِ شیخین اس کو ولایت و امارت سے ہرگز نہ نوازتے۔ مزید برآں حضرات معاویہ بن ابی سفیان، ابو سفیان بن حرب اور عمرو بن العاص وغیرہ رضی اللہ عنہم کو روایتِ حدیث جیسی اہم شاخِ ایمان میں عادل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی سبب سے ان تمام موخر الذکر حضرات پر بالعموم اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر بالخصوص لعنت کرنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ اگر کوئی اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس علمی بحث اور فکری تجزیہ کے بعد امام ابن تیمیہ جنگ جمل کے باب میں یہ تصریح کرتے ہیں کہ اتحاد ثلاثہ میں شامل صحابہ کرام یعنی حضرات طلحہ و زبیرؓ اور ام المومنین عائشہؓ کا موقف صحیح تھا کیونکہ انھوں نے خلیفہ مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون ناحق کا قصاص لینے کے لیے صحیح اقدام کیا تھا جبکہ جنگ بھڑکانے کی ذمہ داری فریقِ مخالف یا دوسرے سازشیوں اور حضرت عثمان کے قاتلوں کی تھی۔[۳۲]

جنگ صفین کے ضمن میں عموماً قرآن کریم کی آیت:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ	اور اگر دو فرقے مسلمانوں کے آپس میں
اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا	لڑ پڑیں، تو ان میں ملاپ کرا دو۔ پھر اگر چڑھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الحجرات: ۹)

جاوے ایک ان میں دوسرے پر، تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے، جب تک پھر آوے اللہ کے حکم پر، پھر اگر پھر آیا تو ملاپ کراؤ ان میں برابر، اور انصاف کرو بیشک اللہ کو خوش آتے ہیں انصاف کرنے والے۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

کی شہادت پیش کر کے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ طائفہ باغیہ سے مراد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب تھے اور وہ برسر باطل تھے کہ انھوں نے خلیفہ برحق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تھی جبکہ خلیفہ چہارم اور ان کے اصحاب برسر حق تھے کہ وہ باغیوں کی بغاوت کچل کر ان کو خلیفہ اسلام کا تابع بنانا چاہتے تھے۔ اسی کی تائید میں اس طرز فکر کے علماء و مفکرین وہ حدیث نبوی پیش کرتے ہیں جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصریح فرمائی تھی کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو جو ایک جلیل القدر اور عظیم صحابی تھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاندین نے اس حدیث کے مصداق کا اطلاق حضرت معاویہ اور ان کی فوج پر کیا ہے کیونکہ حضرت عمار حضرت علی کی طرف سے شریک جنگ تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ وہ حضرت علی کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے لہٰذا فریق مخالف لامحالہ اس حدیث نبوی کا مصداق بنتا اور باغی گروہ ٹھہرتا ہے۔ ان دونوں دلیلوں کی بنا پر ہمارے بہت سے علماء اور مفکرین نے حضرت معاویہ اور ان کے اصحاب کو باغی، گمراہ اور برسر باطل ٹھہرا کر دوسری تمام احادیث نبوی، مشاجرات صحابہ کے بارے میں اہلسنت کا متفقہ مسلک اور عدالت صحابہ کا مسلمہ اصول سبھی کچھ نظر انداز کر دیا ہے۔[۳۵] ●

● یہ حدیث متعدد کتابوں میں مروی ہے اور سند کے لحاظ سے بہت قوی ہے کہ "باغی گروہ حضرت عمارؓ کو قتل کرے گا" فاضل مقالہ نگار نے اس کے مفہوم کی وضاحت نہیں کی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ بعض وہ صحابہ جو اس جنگ میں غیر جانب دار تھے یا یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ حق کس کے ساتھ ہے؛ حضرت عمارؓ کی شہادت کے بعد انھیں حضرت علیؓ کے برسر حق ہونے پر شرح صدر ہو گیا یہی جمہور امت نے آج تک سمجھا ہے۔ کیا اس کا یہ سمجھنا غلط ہے؟ (جلال الدین)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام ابن تیمیہ نے مذکورہ بالا آیتِ قرآنی اور حدیثِ نبوی کے بارے میں بہت ہی متوازن اور صداقت پسندانہ طرزِ فکر و تحریر اختیار کیا ہے۔ انھوں نے اس مفصل بحث کا آغاز اس فقہی مسئلہ سے کیا ہے کہ باغیوں اور سیاسی مخالفوں سے قتال بہتر تھا یا اس سے اجتناب؟ اور پھر بعض ائمہ کرام کا یہ مسلک و فتویٰ بیان کیا ہے کہ قتال سے اجتناب بہتر تھا۔ امام موصوف نے اسی طرح فریقین کے بارے میں علماء امت کے تین مسلک بیان کیے ہیں: اول، حضرت علی امامِ برحق اور خلیفۂ منتخب تھے اور ان کی خلافت نص سے ثابت ہے اس لیے ان سے قتال کرنے والا گروہ باغی تھا۔ انھوں نے اس طبقۂ علماء کے متعدد دلائل حدیث وغیرہ سے دیئے ہیں جن میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے قتل پر مشتمل حدیث بھی شامل ہے۔ بقول امام ابن تیمیہ ان دلائل سے یہ گروہ یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت علی کے امام برحق اور واجب الاطاعت ہونے کے سبب ان سے قتال کرنے والا (مخطئ) خطا کار تھا خواہ تاویل کرنے والا باغی ہو یا بلا تاویل کرنے والا مخالف۔ حضرت یحییٰ بن معین نے جو احادیث نبوی کے ایک بڑے ناقد اور فن کے عظیم امام تھے تاویل کرنے والے باغیوں سے قتال کرنے کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سنت سے جو استدلال کیا ہے اس پر نکیر کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا وہ حضرات طلحہ و زبیر کو بھی باغی قرار دیں گے؟ امام احمد بن حنبل نے اپنے استدلال میں یہ فرمایا ہے کہ اگر سیرتِ علی کی پیروی نہ کی جائے تو باغیوں سے قتال کے لیے انھیں خلفائے راشدین کی کوئی سنت نہ ملتی[۳۹] موخر الذکر استدلال بالکل صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے مرتدوں، مانعین زکوٰۃ اور دوسرے مدعیانِ نبوت سے جنگ کر کے اس کی نظیر قائم کر دی تھی اور پھر سیرتِ علی سے اگر باغیوں کے خلاف قتال کی سنتِ خلفاء تلاش ہی کرنی تھی تو وہ خوارج کے خلاف ان کی سنت سے مل سکتی ہے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین سے کیوں کر مل سکتی ہے؟

امام ابن تیمیہ کے مطابق دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں فریق حق پر تھے اور اس قول کا مدار اس اصول پر ہے کہ ہر مجتہد عملاً صواب پر ہوتا ہے اور اگر اس نے کوئی غلطی کی بھی ہے تو وہ اس کے نیک نیت ہونے کو مشکوک نہیں بناتی۔ یہ معتزلہ اور اشاعرہ کے متکلمین اور اہلِ کلام کا قول ہے تیسرا قول یہ ہے کہ دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک باصواب و برحق تھا مگر اس کی حتمی تعیین نہیں کی جا سکتی۔ یہ تینوں اقوال ابن حامد اور قاضی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وغیرہ نے بیان کیے ہیں اور وہ اہلِ بصرہ، اہلِ حدیث اور اہلِ کلام کے قول کے مشابہ ہیں۔ امام احمد نے تیسرے قول پر تنقید کی ہے۔ اکثر علمائے اہلسنت اور ائمہ حدیث نے حضرت علی کو حق کے زیادہ قریب قرار دیا ہے (اولیٰ بالحق واقرب الیہ)۔ امام ابن تیمیہ اس پوری بحث و تجزیہ کا نتیجہ یہی نکالتے ہیں کہ فریقین — حضرات علی و معاویہ — حق و صواب پر تھے البتہ حضرت علی اولیٰ واقرب الی الحق تھے۔[۵۵]

شیخ الاسلام نے مذکورہ بالا آیت قرآنی پر کافی طویل اور مفصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طائفۂ باغیہ (باغی گروہ) سے قتال و جہاد کا حکم دیا ہے۔ اگر باغی گروہ سے مراد فریق مخالف ہوتا تو اعیانِ صحابہ اس سے پہلوتہی نہ کرتے جو حکمِ نبوی کے مطابق غیر جانبدار ہو گئے تھے۔ اگر صورتِ حال اور آیت کی یہ تفسیر مان لی جائے تو صحابۂ کرام کی اکثریت پر حکمِ الٰہی سے نافرمانی کرنے کا الزام عائد ہو سکتا ہے اور وہ نعوذ باللہ اس سے پاک و منزہ تھے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ غیر جانبدار صحابۂ کرام اس آیتِ کریمہ میں مذکور طائفہ باغیہ سے مراد فریقِ مخالف کو نہیں لیتے تھے یہی تمام علمائے حدیث اور عام ائمہ سنت کا مذہب ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر حضرت علیؓ قتال نہ کرتے تو افضل تھا۔ امام ابن تیمیہ نے اس مسلک کی تائید میں حضرت حسن بن علیؓ کا بھی ایک قول پیش کیا ہے جو قتال کے خلاف تھے۔ اس کے بعد امام موصوف نے امام احمد بن حنبل اور دوسرے سلف و خلف علماء کے متعدد اقوال بیان کیے ہیں جو قتال کے وجوب اور عدمِ قتال کے افضل ہونے سے متعلق ہیں۔ خود ابن تیمیہ کا عقیدہ ہے کہ عدمِ قتال افضل تھا اور کہا ہے کہ اگر قتال نہ کیا گیا ہوتا تو فتنہ کم پیدا ہوتا یا اس میں اضافہ کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ مزید براں یہ حقیقت بھی یاد رکھنے کی ہے کہ باغیوں/مخالفوں یا فریق ثانی نے قتال کی ابتدا نہیں کی تھی بلکہ ابتدا حضرت علی کی جانب سے ہوئی تھی۔

امام موصوف نے اس کے بعد قتال کی ابتدا، قتال کے بعد اصلاح اور اصلاح کے بعد بغاوت اور اس کے بعد طائفۂ باغیہ (باغی گروہ) سے قتال کے مسائل پر کافی مفصل بحث کی ہے اور اس کی مختلف فروع و جزئیات کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے فقہی اور نظری بحث کے بعد حضرات علی و معاویہ دونوں کے دلائل کو مفصل بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک دلیل وہ حدیث نبوی ہے جو حضرت معاویہ نے اپنے موقف کی تائید میں پیش کی تھی کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"میری امت کا ایک گروہ اللہ کے حکم پر ہمیشہ قائم رہے گا، ان کو نہ مخالفوں کی مخالفت اور نہ ساتھیوں کی غداری قیامت تک نقصان پہونچا سکے گی"۔ یہ حدیث حضرت عمار کے قتل کی طرف اشارہ کرنے والی حدیث سے معارض ہے۔ امام ابن تیمیہ نے تمام احادیث کو جمع و تطبیق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فریقین — حضرات علی اور معاویہ — برسر حق تھے۔ حضرت معاویہ اور ان کے اصحاب بھی برسر حق تھے اور حضرت علی اور ان کے متبعین بھی اور موخرالذکر حق کے زیادہ قریب تھے۔ حضرت عمار کے اصلی قاتل وہی لوگ تھے جنھوں نے حضرت عثمان کو قتل کرکے فتنہ وافتراق کی بناڈالی تھی اور امت اسلامی کا شیرازہ منتشر کیا تھا۔ قتال وجدال سے دونوں فریق دائرہ ایمان سے خارج نہیں ہوئے تھے کیونکہ مذکورہ بالا آیتِ قرآنی دونوں فریقوں کو مومنین کے زمرہ میں داخل وشامل رکھتی ہے۔ علامہ موصوف یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ قتال کی ابتدا حضرت علیؓ نے کی تھی نہ کہ حضرت معاویہ نے۔ پھر آیتِ کریمہ کے مطابق بغاوت کا مصداق وہ گروہ ہوگا جو اصلاح کو توڑے۔ چونکہ حضرت معاویہ نے تحکیم کی صلح نہیں توڑی تھی اس لیے اس کے مصداق ہرگز نہیں ہوسکتے۔[۱۱۹]

حضرات علی ومعاویہ رضی اللہ عنہما کی خلافتوں کا موازنہ ومقابلہ کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ "خلافتِ علی میں کفار سے کوئی جہاد ہوا اور نہ کوئی نئے شہر وعلاقے فتح کیے گئے اس کے برعکس تلوار اہل قبلہ کے درمیان ہی چلتی رہی۔ ان کی خلافت میں دین اسلام کو کوئی غلبہ بھی حاصل نہیں ہوا بلکہ اہل اسلام کے درمیان فتنہ وفساد پیدا ہوا اور اس سے فائدہ اٹھا کر شام ومشرق کے کفار، نصاریٰ اور مجوس نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی...... حضرت علیؓ اپنے لشکر کے سرکردہ افسروں کے ظلم سے عاجز تھے اور ان کے اعوان ان کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے تھے جبکہ حضرت معاویہ کے اعوان ان کے مددگار اور مطیع تھے...... حضرت معاویہ دمشق اور دیگر بلاد شام پر بیسؔ سال امیر اور پھر بیسؔ سال تک (پورے عالم اسلام پر) خلیفہ رہے۔ (ان چالیسؔ برسوں میں) ان کی رعایا ان کے حسن سلوک تالیف قلب اور خوبیٔ انتظام والصرام کی مداح تھی اور ان پر جان چھڑکتی رہی...... حضرت معاویہ کی خلافت کے زمانے میں جہاد برو بحر ہوا، شہر پر شہر فتح ہوئے، اسلام کی قوت و شوکت میں اضافہ ہوا اور ہر طرح سے اسلامی مملکت میں ترقی اور دین مبین کی ترویج و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشاعت ہوئی"۔ امام ابن تیمیہ نے اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب پر پوری ایک فصل باندھی ہے۔[۴۲]

بہت سے علمائے اہل سنت اسی طرح ایک موازنہ حضرت معاویہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافتوں کے درمیان مختصر طور سے کرتے ہیں اور اعمال و کردار کی بنا پر حضرت عمر ثانی کو خلیفہ راشد قرار دیتے ہیں[۴۳] جبکہ حضرت معاویہ کو مسلم ملوک میں اولین ملک اور سلاطین میں بہترین سلطان بتاتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے بھی یہ موازنہ کیا ہے مگر وہ اس موازنہ سے بہت مختلف ہے۔ امام صاحب نے اعمال کے معیار و مدار کے تحت یہ بحث چھیڑی ہے کہ صحابیت وہبی شے ہے، کسبی اور اکتسابی نہیں۔ لہٰذا اعمال صالحہ خواہ کتنے زیادہ ہوں مگر کوئی غیر صحابی شخص صحابی رسول سے کسی طرح افضل نہیں ہو سکتا۔ امام موصوف نے پہلے تو اس بحث میں قرون ثلاثہ کے اصحاب کی تعریف کی ہے اور امت کے اس اجماع کا ذکر کیا ہے کہ جملہ صحابہ کو جملہ تابعین پر یا جملہ غیر صحابہ پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ آیا ہر فرد صحابی ہر فرد تابعی سے افضل ہے یا نہیں اور پھر اس حیثیت سے دونوں خلفاء اموی کا موازنہ و مقارنہ کیا ہے۔ پھر متعدد علماء امت جیسے قاضی عیاض، امام عبداللہ بن مبارک اور امام احمد بن حنبل کا قول بیان کیا ہے کہ ہر صحابی بلا لحاظ عمل افضل ہے۔ بعض علماء کے اس مسلک کا بھی ذکر کیا ہے کہ اگرچہ حضرت عمر ثانی عدل و زہد میں حضرت معاویہ سے بڑھے ہوئے تھے تاہم صحابی ہونے کے سبب حضرت معاویہؓ ان سے افضل ہیں... اس کے ساتھ ہی بعض دوسرے علماء سلف کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں جو غبار حضرت معاویہ کی ناک میں داخل ہوا تھا وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے افضل ہے"[۴۴]۔ ظاہر ہے کہ اگر سیرت و کردار اور اعمال صالحہ کی بنا پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ راشد قرار دیا جا سکتا ہے تو حضرت معاویہؓ کی صحابیت کا تقاضا ہے کہ ان کو بدرجہ اولی خلیفہ راشد قرار دیا جائے۔ جس طرح ایک غیر صحابی کو ایمان و عقیدہ کے باب میں کسی صحابی پر فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی اسی طرح عقل و منطق اور روحِ اسلام کے مطابق اسے صحابی پر عمل و درجہ میں بھی کوئی تفوق نہیں مل سکتا۔ پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا زہد و عدل میں حضرت معاویہ سے افضل ہونا بھی بحث طلب ہے۔ حضرت عمر ثانی کے خلاف وضعی اور من گھڑت روایات کا انبار نہیں لگایا گیا اس لیے وہ اپنی پاکیزہ صورت میں نظر آتے ہیں۔ اگر حضرت معاویہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا معروضی مطالعہ اور ان کی سیرت و کردار کے بارے میں صحیح روایات کا تجزیہ کر کے لکھا جائے تو وہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے بھی بہتر نظر آئیں گے۔●

خلافت و حکومتِ یزید بن معاویہ کی نوعیت اور خلیفۂ اموی کی شخصیت و کردار کے بارے میں عام طور سے اہل سنت کے یہاں بھی مخالفانہ نقطۂ نظر پایا جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اس باب میں اپنے مجموعۂ فتاویٰ میں تین مسلکوں کا ذکر کیا ہے۔ صحابہ کرام کے بارے میں رافضیوں کے طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ صحابہ کرام کو برا بھلا کہا کرتے تھے چنانچہ علماء نے سب و شتم صحابہ کے مجرموں کو سزا دینے کا فتویٰ دیا۔ اس کے بعد مخالفوں کے طرزِ عمل میں اور شدت پیدا ہوئی اور صحابہ کرام کی تکفیر کا آغاز ہوا.... مگر اس عہد میں یزید بن معاویہ کے بارے میں کوئی کلام نہیں کرتا تھا اور نہ اس باب میں کلام کرنا دین کا کام سمجھا جاتا تھا۔ پھر کچھ اور باتیں پیدا ہوئیں اور بعض لوگوں نے یزید بن معاویہ پر لعنت بھیجنی شروع کی اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ وہ دوسروں یعنی صحابہ کرام کو ہدفِ لعنت بنانے کا بہانہ تلاش کریں۔ اکثر علماء اہلسنت نے کسی معین شخص پر لعنت کرنے کو ناجائز گردانا ہے۔ بہر حال مخالفینِ حکومت اور معاندینِ خلافت کے ردعمل میں بعض دوسرے لوگوں نے یزید کو صالحین اور ائمۂ ہدایت شمار کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد بقول امام صاحب یزید بن معاویہ کے بارے میں دو غالی طبقے پیدا ہو گئے جو ایک دوسرے کی ضد تھے: ایک طبقہ کے خیال میں وہ کافر و زندیق تھے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے

● حضرت معاویہؓ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کا جو شرف حاصل تھا وہ کبھی کسی غیر صحابی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ان کی خوبیوں سے انکار بھی ایک بڑا ظلم ہے، لیکن کیا اس کی وجہ سے ان کے تمام اقدامات کو صحیح اور برحق قرار دے دیا جائے؟ اگر یہ اقدامات برحق تھے تو حضرت علیؓ کے بعد ان کا بھی خلفاء راشدین میں شمار ہونا چاہیے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان مورخین ہاشمیوں کے طرف دار تھے اور امویوں سے تعصب برتتے تھے لیکن یہ بات ناقابل تصور ہے کہ مسلمان مورخین اور سیرت نگار، محض اس وجہ سے ایک صحابئ رسول کے خلاف من گھڑت اور وضعی روایات جمع کر دیں کہ وہ اموی تھے اور اسی خاندان کے ایک دوسرے فرد، عمر بن عبد العزیزؒ کو خلیفۂ راشد تسلیم کر لیں، جنھیں بہرحال صحابیت کا شرف حاصل نہیں تھا۔ (جلال الدین)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو قتل کیا اور حرہ میں انصار اور ان کی اولاد کا قتل عام کیا تاکہ وہ اپنے کافر رشتہ داروں کے قتل کا بدلہ لے سکیں۔ یہ طبقۂ فکر ان پر شراب نوشی اور دوسرے معاصی اور فواحش کے ارتکاب کا الزام بھی عائد کرتا ہے۔ ان کے برعکس دوسرا طبقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ امام عادل، ہادی مہدی تھے، وہ صحابہ کرام بلکہ صحابہ کبار میں شامل تھے اور اولیاء اللہ میں سے تھے۔ بعضوں نے تو یہاں تک غلو کیا کہ ان کو انبیاء میں شمار کرنا شروع کر دیا۔ شیخ حسن بن عدی اس غالی فرقے کے رہنما اور قائد تھے مگر ان کے یہاں غلو اتنا بڑھ گیا تھا اور یہ غلو بعد میں پیدا ہوا تھا..... " یزید بن معاویہ کی حمایت و مخالفت میں دو غالی طبقوں کا یہ مبالغہ اہل علم و صاحبان ایمان کے اجماع کے خلاف ہے اس کے بعد امام ابن تیمیہ اپنا عقیدہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یزید بن معاویہ خلافت عثمانی میں پیدا ہوئے اور ان کو عہد نبوی نہیں ملا تھا لہٰذا علمائے اہلسنت کا اتفاق ہے کہ وہ صحابی نہیں تھے اور نہ وہ دین و صلاح کی انتہائی شہرت رکھنے والوں میں شامل تھے۔ وہ مسلمان نوجوانوں میں سے ایک تھے: نہ کافر تھے اور نہ زندیق۔ اپنے والد گرامی کے بعد وہ خلیفہ بنے۔ ان کی ولایت و حکومت کو کچھ لوگوں نے پسند کیا اور کچھ نے ناپسند۔ ان میں شجاعت و کرم تھا اور فواحش و معاصی کے ایسے مظاہر نہ تھے جیسا کہ ان کے معاندین ان کے بارے میں بیان کرتے ہیں"۔ [۶۶]

عہد یزیدی پر تبصرہ کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ " ان کی امارت کے زمانے میں بعض اہم واقعات پیش آئے: ان میں سے ایک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ تھا۔ یزید بن معاویہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ ان کے قتل پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور نہ ان کے دندان مبارک پر چھڑی ماری تھی کیونکہ حضرت حسین کا سر مقدس شام نہیں لے جایا گیا تھا۔ لیکن خلیفہ اموی نے حضرت حسین کو روکنے اور آگے بڑھنے سے منع کرنے کا حکم دیا تھا خواہ جنگ کے ذریعہ ہو۔ عمال حکومت نے خلیفہ کے حکم سے تجاوز کیا اور وہ واقعہ پیش آ ہی گیا۔ اس کے بعد امام موصوف نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا الزام شمر ذی الجیوش، عبیداللہ بن زیاد اور عمرو بن سعد پر ڈالا اور ان کی شہادت کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی مانند امت اسلامی کے عظیم مصائب میں شمار کیا ہے جو اس امت کو فتنہ میں ڈالنے کے عظیم ترین اسباب میں ہیں اور ان دونوں کے قاتلوں کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین و شریر ترین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخلوقِ الٰہی قرار دیا ہے۔ اس کے بعد امام صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "حب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اہل وعیال یزید بن معاویہ کے پاس پہونچے تو اموی خلیفہ نے ان کا اعزاز واکرام کیا اور بعزت واحترام ان کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ یزید کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ابن زیاد کے فعل کے سبب اس پر لعنت بھی کی اور کہا کہ میں قتل حسین کے بغیر بھی اہلِ عراق کی اطاعت سے راضی تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اموی حکمراں نے ان کی شہادت پر کسی ناگواری کا اظہار بھی نہیں کیا اور نہ اس کا انتقام لیا جو حکمرانوں پر واجب تھا۔ اس لیے بعض اہل حق نے ان کو دوسرے امور کے لیے بھی ملامت کی لیکن اس باب میں ان کے معاندین اور دشمنوں نے ان پر بہت بہتان تراشی بھی کی ہے۔ امام صاحب نے دوسرا واقعہ یہ بیان کیا ہے کہ مدینہ منورہ والوں نے ان کی بیعت توڑی لہٰذا خلیفہ اموی نے اپنے لشکر کو ان پر حملہ کرنے کا حکم دیا جس نے تین دن تک مدینہ کو لوٹا اور پھر ان کے حکم سے مکہ مکرمہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ بھی عدوان وظلم تھا جو ان کے حکم سے کیا گیا۔ امام موصوف کا عقیدہ ہے کہ "یزید سے نہ محبت کی جائے اور نہ ان پر لعنت کی جائے اور نہ ان کی حدیث روایت کی جائے۔ مسلمانوں کے علماء وائمہ کے نزدیک یزید ایک بادشاہ (ملک) تھے، وہ ان سے صالحین امت اور اولیاء اللہ جیسی محبت نہیں رکھتے اور نہ ان کو برا بھلا کہتے ہیں۔ البتہ بعض اہلسنت ان کے ظلم وعدوان کے سبب ان پر لعنت کرنے کو جائز سمجھتے ہیں جبکہ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ان سے محبت رکھتا ہے اور ان کی حکومت کا قائل ہے کیونکہ وہ عہد صحابہ کے بعد (یعنی دور تابعین میں) مسلمانوں کے والی تھے اور صحابہ کرام نے ان سے بیعت کی تھی ان لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے بارے میں جو روایات عام طور سے بیان کی جاتی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ وہ بہت سے محاسن و فضائل کے حامل تھے اور انھوں نے اپنے تمام افعال میں اجتہاد کیا تھا لہٰذا ان کا درجہ مجتہد کا تھا۔ امام صاحب نے اس موضوع پر اپنا خیال یہ ظاہر کیا ہے کہ صحیح مسلک علماء وائمہ امت کا ہے کہ نہ ان سے محبت کی جائے اور نہ لعنت وملامت کا اظہار کیا جائے۔ اگر وہ فاسق وظالم تھے تو اللہ تعالیٰ فاسق وظالم کی مغفرت بھی فرما سکتا ہے خاص کر اگر وہ عظیم حسنات کا حامل ہو۔ امام ابن تیمیہ اس کے بعد امام بخاری کی صحیح سے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدیث نبوی نقل کی ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر غزوہ کرے گا مغفرت سے نوازا جائے گا" اور یہ پہلا لشکر جس نے روم پر حملہ کیا تھا یزید بن معاویہ کی ماتحتی میں گیا تھا اور اس میں بزرگ صحابی حضرت ابو ایوب انصاری بھی شامل تھے..... لہٰذا یہ واجب اور ضروری ہے کہ اس معاملہ میں اقتصار کیا جائے اور یزید بن معاویہ کے ذکر سے اور اس کے سبب مسلمانوں کو آزمائش وابتلا میں ڈالنے سے گریز کیا جائے کیونکہ وہ ایسی بدعت ہے جو اہل سنت والجماعت کی روش کے خلاف ہے کیونکہ اسی کے سبب بعض جاہلوں نے یہ اعتقاد پیدا کر لیا ہے کہ یزید بن معاویہ اکابر صالحین اور عادل اماموں میں سے تھے حالانکہ یہ صریح غلطی ہے" امام ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں بھی تقریباً یہی موقف اختیار کیا ہے۔ وہ دوسرے اموی اور عباسی خلفاء کی مانند یزید بن معاویہ کو خلیفہ وسلطان اور صاحب قوت وشوکت اور ملک برحق سمجھتے تھے جن کی بیعت پر صحابہ کرام اور اصحاب رائے وحشمت کی غالب اکثریت نے اتفاق کیا تھا اور ان کا اقتدار تمام بلاد اسلامیہ پر سوائے مکہ مکرمہ کے قائم ونافذ ہو چکا تھا۔ یہ وہ تاریخی حقیقت ہے جس سے کسی صاحب انصاف کو انکار نہیں ہو سکتا۔

خروج حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام ابن تیمیہ کا موقف مجموعہ فتاویٰ اور منہاج السنۃ دونوں میں یہی ہے کہ وہ قتال فتنہ اور ابتلائے امت کے بالمقابل اس کے ترک کو افضل وبہتر سمجھتے ہیں جس طرح وہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں شامل وشریک ہونے والے اور جنگ وجدال برپا کرنے والے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے طرز عمل کو تعریف وتحسین کا مستحق نہیں سمجھتے اور نہ ہی ان میں سے کسی فریق کی مذمت وملامت کو جائز قرار دیتے ہیں اسی طرح خروج حسین کے باب میں ان کا مسلک یہی ہے کہ یزید بن معاویہ کی بیعت کے انعقاد کے بعد کسی کے لیے بھی حکومت وقت کے خلاف خروج کرنا جائز نہیں تھا۔ وہ اصولی طور سے شورش وخروج، انقلاب وبغاوت اور تشدد آمیز طریقوں سے تبدیلی حکومت کو حرام قرار دیتے ہیں کیونکہ اس کے سبب فوائد کی بجائے نقصانات اور تعمیر کی جگہ تخریب عموماً پیدا ہوتی ہے۔ اپنے اس مسلک وخیال کی تائید میں وہ نظری اور اصولی دلائل کے علاوہ کئی تاریخی واقعات کی شہادت بھی پیش کرتے ہیں جیسے واقعہ حرہ، خروج ابن الاشعث، بغاوت ابن مہلب، خروج ابو مسلم خراسانی اور خروج نفس زکیہ وابراہیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وغیرہ کہ ان تمام واقعات اور بغاوتوں میں امتِ اسلامی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا سوائے نقصان کے۔ اس باب میں وہ واضح طور سے فرماتے ہیں کہ "جب کوئی خلیفہ اقتدار پر قابض ہو جائے ...... پھر...... اس سے لڑ کر اسے اقتدار سے محروم کرنے کی کوشش رائے فاسد پر مبنی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ خونریزی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے خواہ خروج کرنے والا دیندار و متقی ہی کیوں نہ ہو۔" امام موصوف نے اپنی اس رائے کی بنیاد نصوصِ شرعیہ، احادیث صحیحہ اور بزرگانِ سلف کے اقوال و آثار پر رکھی ہے۔ انھوں نے اسی کسوٹی پر خروجِ حسین کو پرکھا ہے۔ نظری بحث کے بعد وہ مساعیٔ حسینی کے بارے میں تجزیہ کرتے ہیں" چنانچہ جن واقعات سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ دوچار ہوئے انھوں نے ثابت کر دیا کہ مانعینِ خروج کی رائے درست تھی جو ان کو برابر کوفہ جانے سے روکتے رہے کیونکہ حضرت حسین کے خروج میں کوئی دینی اور دنیوی مصلحت مضمر نہ تھی۔ البتہ اس کا المناک نتیجہ یہ نکلا کہ ظالم کوفیوں نے نبیرۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحالت مظلومی شہید کر ڈالا اور اس خروج و قتل سے امت اسلامی میں وہ فساد رونما ہوا جو اس صورت میں ہرگز رونما نہ ہوتا اگر آپ مدینہ منورہ میں اقامت گزیں رہتے۔ حضرت حسین کا اصل مقصد تحصیلِ خیر اور دفعِ شر تھا مگر وہ اس خروج سے حاصل نہ ہوا بخلاف ازیں آپ کے خروج و شہادت سے شر و فساد میں اضافہ ہوا جو بعد میں ایک وسیع تر شر و فساد کا پیش خیمہ بن گیا ......[illegible]" امام ابن تیمیہ نے اس بابِ المناک کے خاتمہ پر یہ تبصرہ بھی کیا ہے کہ خلیفۂ اموی یزید بن معاویہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کا ذمہ دار نہیں اور اس بنا پر ان کی مذمت و ملامت اور لعن طعن بھی جائز نہیں کیونکہ یہی صحیح موقف اہلسنت ہے تاہم اس میں بھی کوئی شک و شبہ نہیں کہ قتلِ حسین جرمِ عظیم ہے، اس کے ارتکاب کرنے والے اور اس پر رضامندی کا اظہار کرنے والے دونوں عذاب الٰہی کے مستحق ہیں لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ خلیفہ سوئم حضرت عثمان رض کی المناک شہادت سے زیادہ بڑا جرم ہرگز نہیں۔"[illegible]

اسلامی تاریخ کے بقیہ ادوار کے بارے میں امام ابن تیمیہ کا موقف یہ ہے کہ وہ خلافتِ نبوت نہیں تھی بلکہ خلافتِ غیر نبوت تھی جب خلفاء نبوت ہی نہیں رہے تو ان کی خلافتِ نبوت کیسے ہو سکتی تھی۔ اموی حکمرانوں کے بارے میں امام صاحب کا مسلک بہت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واضح ہے جیسا کہ اوپر قرونِ ثلاثہ اور خلافت نبوت اور خلافت ملک و رحمت والی بحثوں میں تفصیل کے ساتھ ذکر آچکا ہے۔ علامہ موصوف ان کو امامِ عادل و صالح قرار دیتے ہیں اور ان کو خلفاء اسلام کے لقب سے بھی نوازتے ہیں۔ ان مسلمان خلفاء کو وہ ملوک و سلاطین اسلام بھی کہتے ہیں مگر اس سے ان کی مراد حدیث نبوی کے مطابق ملوک رحمت ہے نہ کہ غیر دینی اور غیر اسلامی ملوکیت کے حکمراں۔ امام صاحب اس کے لیے دلیل یہ دیتے ہیں کہ ان حکمرانوں، سلطانوں اور خلفاء کا حال، سیرت و کردار عام مسلمانوں کے مانند تھا اور وہ حسنات و سیئات، خوبیوں و خامیوں، نیکیوں اور بدیوں کے حامل تھے اور اسی طرح ان کی خلافت و حکومت بھی اچھے بُرے دونوں پہلوؤں کی حامل تھی۔ جس طرح علامہ موصوف نے صدرِ اسلام کے تاریخی ادوار اور مختلف خلفاء راشدین کے عہدوں کا موازنہ کیا ہے اسی طرح وہ خلافت اموی اور خلافت عباسی کا بھی مقارنہ کرتے ہیں اور بدلائل ثابت کرتے ہیں کہ اموی خلفاء کو ہر لحاظ سے عباسی خلفاء پر فضیلت حاصل تھی۔ مجموعۂ فتاویٰ وغیرہ میں شیخ الاسلام نے اس نوع کی اور بھی اصولی، نظری اور تاریخی اور واقعاتی بحثیں کی ہیں لیکن ان کی سب سے اہم بحث یہ ہے کہ وہ خلفاء اربعہ کی خلافت راشدہ کے بعد اموی خلافت اور اس کے بعد کی عباسی خلافت کو اسلامی اور جائز ہی تسلیم کرتے ہیں غیر اسلامی اور ناجائز نہیں اگرچہ وہ طبقہ بہ طبقہ اور عہد بہ عہد تنزل کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ بعد کی حکومتیں خلافت نبوت نہیں تھیں مگر وہ خلافت رحمت / ملک و رحمت ضرور تھیں[۵۵]

امام ابن تیمیہ کی منفی اور مثبت، الزامی اور اثباتی، جوابی اور طبعی تحریروں کی روشنی میں خلافتِ اسلامی یا تاریخ اسلامی کے باب میں ان کے مطالعہ کا مختصر اور جامع تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے استدلال کی بنیاد ہمیشہ قرآن و سنت، آثارِ صحابۂ کرام اور بزرگانِ سلف کے اقوال پر رہتی ہے۔ ان کی سب سے اہم خصوصیت اس ضمن میں یہ ابھرتی ہے کہ وہ تمام دستیاب مواد کے وسیع تر تناظر میں اپنا فکری اور واقعاتی استدلال پیش کرتے ہیں اور محض ایک دو واقعات یا احادیث و اقوال کی روشنی میں استنباط نہیں کرتے ان کی یہ جامعیت ایک طرف تو ان کے تبحر علمی پر دلالت کرتی ہے تو دوسری طرف ان کی دقتِ نظر اور دور رس تجزیہ و تحلیل کی صلاحیت پر۔ دوسری اہم خصوصیت ان کے فکر و قلم کا توازن ہے وہ کسی فرد یا طبقہ کی محبت و عقیدت میں نہ تو صدق و امانت کا دامن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھوڑتے ہیں اور نہ کسی کی دشمنی اور عداوت میں افترا پردازی اور بہتان تراشی کا کاروبار چلاتے ہیں جس کو جدید عہد میں معروضی تاریخ نگاری اور غیر جانبدارانہ طرزِ نگارش کہا جاتا ہے وہ امام ابن تیمیہ اور علامہ ابن خلدون کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان کی شرافتِ قلم بھی ان کی تحریروں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ سنجیدہ اور متین لہجے میں اپنی بات بلا کسی طعن وتشنیع کے کہتے ہیں۔ شیخ الاسلام کی تحلیل وتجزیہ تاریخ اسلامی کا ایک بنیادی عنصر یہ ہے کہ وہ اسلامی احکام، شرعی قوانین اور اس کی روح کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ اس کے لیے نہ تو فکری اصولوں کو اپنی پسند و ناپسند کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتے ہیں اور نہ کسی خود ساختہ اصول و فکر پر واقعات وحقائقِ تاریخ کو توڑتے مروڑتے ہیں۔ اس باب میں انھوں نے ایک اہم اصول یہ وضع کیا ہے کہ جس طرح دینی وشرعی احکام کے لیے صحابۂ کرام کا عمل وتعامل اور اقوال وآثار اور فہم وبصیرت معیار ہیں اسی طرح تاریخ اسلام اور تاریخ خلافت کے لیے بھی ان کی سنت معیار ہے اور ہمارے تمام معیاراتِ حق وباطل کو ان کے تابع ہونا چاہیے۔ حضرت امام کے تاریخی تجزیہ اور مطالعہ پر بحث کے لیے ایک دفتر درکار ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ آخر میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ کے مطالعہ وتجزیہ تاریخ اسلامی کو سمجھنے اور اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس میں بڑا توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے اس سے وہ مسائل حل ہو سکیں گے جن کی بنیاد پر اسلامی تاریخ بلکہ خود اسلام کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے۔

تعلیقات وحواشی

۱؎ اسلامی تاریخ کے مآخذ و مصادر کے تنقیدی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو: راقم سطور کا مقالہ "اسلامی تاریخ نگاری کے مسائل اور ان کا حل" مجلہ علومِ اسلامیہ، ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جلد ۱۳ شمارہ ۱-۲ سنہ ۱۹۸۶ء، ص ۱۰۴-۶۹ نیز مولانا شبلی، سیرۃ النبی، دار المصنفین اعظم گڑھ سنہ ۱۹۷۳ء، جلد اول ص ۸۵-۱؛ سعید احمد اکبر آبادی، عثمان ذوالنورین، ندوۃ المصنفین دہلی سنہ ۱۹۸۲ء۔ ص ۵۳-۵؛ محمد اسحاق صدیقی سندیلوی، اظہار حقیقت، دار الکتب امدادیہ کراچی، اول ص ۱۲۴-۸۸؛ عبد العزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند المسلمین، مطبعہ کاثولیکیہ بیروت سنہ ۱۹۶۰ء ص ۱۰۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرانز روزنتھال، مسلم تاریخ نویسی کی تاریخ (انگریزی)، لائیڈن ۱۹۵۲ء، صفحہ ۵۹ اور نثار احمد فاروقی، ابتدائی مسلم تاریخ نویسی (انگریزی) ادارہ ادبیات دلی ۱۹۷۹ء، صفحہ ۳۰۳-۲۷۱ وغیرہ۔

۲ـہ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: ابوبکر ابن العربی، العواصم من القواصم، لجنۃ الشباب المسلم قاہرہ ۱۳۷۱ھ، ابن خلدون، مقدمہ، مطبوعہ مصطفیٰ محمد (مکتبہ تجاریہ) قاہرہ (غیر مورخہ)؛ حافظ ابو عبداللہ محمد بن عثمان الذہبی، المنتقیٰ من منہاج الاعتدال، مرتبہ محب الدین الخطیب، المطبعۃ السلفیہ، قاہرہ ۱۳۷۴ھ؛ اور امام ابن تیمیہ کی مذکورہ زیریں کتابیں۔

۳ـہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، خلافت و ملوکیت، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۲

۴ـہ ابن تیمیہ، منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعۃ والقدریۃ (آئندہ صرف منہاج السنۃ) مکتبۃ الریاض الحدیثیۃ الریاض (غیر مورخہ)۔ یہ طباعت دراصل مطبعہ امیریہ کی طباعت ۱۳۲۲ھ کا عکس ثانی ہے؛ مجموعہ فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ (آئندہ صرف مجموعۂ فتاویٰ) مرتبہ عبدالرحمٰن بن محمد بن قاسم العاصمی النجدی الحنبلی اور ان کے فرزند گرامی محمد، کتاب علم السلوک طبع اول ۱۳۹۸ھ

۵ـہ حافظ ذہبی، المنتقیٰ من منہاج الاعتدال فی نقض کلام اہل الرفض والاعتزال، مرتبہ محب الدین الخطیب، المطبعۃ السلفیۃ و مکتبہا، القاہرہ ۱۳۷۴ھ؛ اردو ترجمہ بعنوان المنتقیٰ من منہاج السنۃ النبویۃ۔ از غلام احمد حریری، ادارہ احیاء السنۃ گھرجاکھ (گوجرانوالہ) ۱۹۶۶ء

۶ـہ اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، خلافت و ملوکیت، کا باب ششم صفحہ ۲۰۷-۲

۷ـہ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۳۵، صفحہ ۴۲-۴۶ امام موصوف خلیفۃ اللہ اور نائب اللہ کے قائلین بالخصوص شیخ ابن عربی پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے سورہ بقرہ کی آیت ۳۰ اور حدیث نبوی خلق آدم علی صورتہ (اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا) کا مفہوم غلط سمجھا ہے اور اسی طرح فلاسفہ سے اخذ کردہ عالم صغیر (انسان) اور عالم کبیر (اللہ تعالیٰ) کا نظریہ بھی باطل ہے کیونکہ وہ وحدت الوجود کے کافرانہ عقیدہ پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق و مالکِ کل اور ازلی ابدی ہے اور اس کی تمام مخلوقات صرف ماتحت و فانی۔ لہٰذا اس کا کوئی نائب نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نظریۂ خلافت کے ایک اور نقطۂ نظر کے لیے ملاحظہ ہو۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، خلافت و ملوکیت، صفحہ ۳۲-۵۷ نیز کتاب کے باب دوم و سوم۔

۸ـہ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۳۵، صفحہ ۸-۲۲ نیز صفحہ ۳۲-۴۲ وغیرہ۔

۹ـہ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۳۵، صفحہ ۲۵-۲۷ بالخصوص اور صفحہ ۲۵-۱۰ بالعموم؛ ملاحظہ ہو: سید سلیمان ندوی،

© rasailojaraid.com

سیرت النبی، اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء، سوم صد ۲۰۔
ستاہ اس خیال کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ اسلام، اول، بحث بر خلافت حسن رضی اللہ عنہ اور دوم بحث بر خلافتِ معاویہ اور متعدد دوسرے مورخین قدیم وجدید۔
سالہ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۳۵۔ صد ۲۷
سالہ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۳۵، صد ۹-۱۸، صد ۲۶-۲۷ نیز ملاحظہ ہو صد ۲۳؛ مزید بحث ملاحظہ ہو: جلد ۴، صد ۹-۸۷۔ اس حدیثِ نبوی میں الذین یلونہم۔ الذین یلونہم کے الفاظ بہت اہم ہیں اور علماء ومفکرین کی توجیہ وتشریحِ جدید کے متقاضی بھی۔ نیز ملاحظہ ہو: سید سلیمان ندوی، سیرت النبی سوم، صد ۴-۱۳۔
سالہ مجموعۂ فتاویٰ جلد ۳۵، صد ۲۰-۱۸ میں امام موصوف نے مندرجہ ذیل احادیث بیان کی ہیں:

(ا) خلافۃ النبوۃ ثلاثون سنۃ ثم یوتی اللہ ملکہ - او الملک - من یشاء ــــ لفظ ابی داؤد من روایۃ عبد الوارث والعوام۔
(خلافت نبوت تیس سال ہوگی پھر اللہ اپنا ملک ــــ یا ملک ــــ جس کو چاہے گا عطا کرے گا۔ یہ الفاظ ابو داؤد نے عبد الوارث اور عوام کی روایت سے نقل کیے ہیں)

(ب) تکون الخلافۃ ثلاثون عاما ثم یکون الملک (خلافت تیس سال ہوگی پھر ملک ہوگا۔)

(ج) تکون الخلافۃ ثلاثین سنۃ ثم تصیر ملکا (خلافت تیس سال ہوگی پھر وہ ملک ہو جائے گی۔)

(د) فی الحدیث الذی رواہ مسلم: ستکون خلافۃ نبوۃ ورحمۃ، ثم یکون ملک ورحمۃ: ثم یکون ملک وجبریۃ ثم یکون ملک عضوض (امام مسلم نے جو حدیث روایت کی ہے اس کے الفاظ ہیں: عنقریب خلافت نبوت ورحمت ہوگی، پھر ملک ورحمت ہوگی، پھر ملک وجبریہ ہوگا پھر کاٹ کھانے والا ملک ہوگا۔)

(س) انہ من یعش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیرا، علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین من بعدی، تمسکو ابہا عضوا علیہا بالنواجذ، وایاکم ومحدثات الامور، فان کل بدعۃ ضلالۃ (بلاشبہ جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت اختلاف دیکھیں گے میرے بعد تم پر میری سنت اور نیک وہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کی پیروی لازم ہے۔ اسی سے تمسک کرو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اسکو دانتوں سے یعنی مضبوطی سے پکڑے رہو اور نئے نئے معاملات سے بچو کیوں کہ ہر بدعت ضلالت و گمراہی ہے) امام ابن تیمیہ نے یہاں ایک اور حدیث بیان کی ہے لیکن اس کا ذکر آگے اپنے مقام پر آئے گا۔

۱۴؎ المنتقیٰ من منہاج السنۃ، ص۶۷، حاشیہ ۱، اور ص۸۳-۷۷؛ مجموعہ فتاویٰ، جلد ۳۵، ص۸-۴۷ میں فرماتے ہیں کہ تحقیقی بات وہی ہے جو امام احمد نے کہی ہے کہ خلافت صدیقی صحابۂ کرام کی بیعت و اختیار سے قائم ہوئی تھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے وقوع کی خبر تعریف و تحسین کے ساتھ دی تھی۔ نیز ملاحظہ ہو منہاج السنۃ، اول ص۸۲-۱۷۹

۱۵؎ المنتقیٰ من منہاج السنۃ، ص۸-۳۰۷؛ منہاج السنۃ، اول ص۸۲-۱۷۹

۱۶؎ ایضاً ص۴۹۱؛ ص۸۲-۱۷۹ بالترتیب۔

۱۷؎ ایضاً، ص۵-۸۴؛ المنتقیٰ من منہاج الاعتدال، ص۲-۶۱ امام صاحب خلفاء بنی امیہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اہلسنت اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ ان کی تولیت و اطاعت نہ صرف واجب تھی بلکہ حقیقت میں اسی طرح رونما بھی ہوئی۔ اور انھوں نے قدرت و سلطان سے کام لے کر مقاصد امامت: جہاد، حج، جمعہ، عید اور حفاظت شاہراہ وغیرہ قائم کیے۔ لیکن ان کی اطاعت معصیت خداوندی کے کاموں میں واجب نہیں تھی۔

۱۸؎ ایضاً، ۸۵ ۱۹؎ ازالۃ الخفاء، جلد دوم، ص۲۷۹

۲۰؎ مجموعہ فتاویٰ، جلد ۳۵، ص۹-۱۸، ص۲۶ نیز ملاحظہ ہو ص۲۳ اور جلد ۴، ص۹-۸۷

۲۱؎ امام ابن تیمیہ کے سوا تمام دوسرے علماء و مفکرین بھی جنھوں نے اس موضوع پر کلام کیا ہے یہی نظریہ اپنی تحریروں میں بیان کرتے ہیں۔

۲۲؎ حضرت عثمان پر متعدد الزامات اور ان کے جواب کے لیے ملاحظہ ہو۔ سعید احمد اکبر آبادی عثمان ذو النورین، متعدد ابواب۔

۲۳؎ اس نظریہ کے بانی عہد جدید کے ایک عظیم ترین اسلامی مفکر اور دین مبین کے جلیل القدر ترجمان مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ہیں۔ ملاحظہ ہو خلافت و ملوکیت، ص۱۶-۱۰۵

۲۴؎ المنتقیٰ من منہاج السنۃ، ص۶-۵۲۴ اور ص۲۸۵-۱۳-۱۷؛ اس بحث کے لیے مزید ملاحظہ ہو: المنتقیٰ من منہاج الاعتدال، ص۲۰۵-۳۷۴

۲۵؎ المنتقیٰ من منہاج السنۃ، ص۲۸-۱۳-۱۷ وغیرہ نیز المنتقیٰ من منہاج الاعتدال ص۵-۳۷۴

۲۶؎ اس نظریہ کے لیے ملاحظہ ہو۔ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخی حقائق، ادارۃ المعارف کراچی ۱۹۷۶ء، خاص کر صفحات ۲۱۳ - ۱۲۷ ؛ محمد اسحاق صدیقی سندیلوی، اظہار حقیقت، جلد دوم کے متعدد ابواب ؛ سید علی احمد عباسی، امیر المومنین معاویہ کی سیاسی زندگی، انجمن پاسداران حرمت صحابہ کراچی، طبع دوم ۱۹۸۷ء، بحث بر خلافت نبوت صفحات ۲۲۹ - ۱۹۶ بالخصوص ؛ محمود احمد عباسی، خلافت معاویہ و یزید مکتبہ محمود کراچی طبع چہارم ۱۹۶۲ء (طابع کھجوہ، ضلع سارن)، صفحات ۱۱۷ - ۶۶ بالخصوص۔

اس بحث پر تجزیاتی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو ابن خلدون، مقدمہ، صفحات ۲۰۹ - ۲۰۲ خلافت کے ملک میں تبدیل ہونے کی فصل ۲۸۔

۲۷ھ یہ نظریہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے خلافت وملوکیت، صفحات ۲۰۶ - ۱۵۵ میں بدلائل پیش کیا ہے ملوکیت کے نظریہ کے دوسرے قائلین کے لیے ملاحظہ ہو شاہ معین الدین احمد ندوی، تاریخ اسلام دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء، جلد دوم باب اول بحث خلافت معاویہ بالخصوص نیز دوسرے ابواب بالعموم۔

۲۸ھ یہ نظریہ عموماً شیعہ اور خارجی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ سید امیر علی *History of the Saracens* نئی دہلی ۱۹۷۷ء ملاحظہ ہو۔

۲۹ھ مجموعۂ فتاوی، جلد ۳۵، صفحات ۲۰ - ۱۸ ؛ جلد ۱۰، صفحہ ۳۵۶۔ ایک حدیث نبوی یہ ہے: كانت بنو اسرائيل يسوسهم الانبياء، كلما هلك نبيٌّ خلفه نبي، وانه لا نبي بعدي وستكون خلفاء فتكثر، قالوا: فما تامرنا؟ قال: فوا ببيعة الاول فالاول۔ ثم اعطوهم حقهم، فان الله سائلهم عما استرعاهم (بنو اسرائیل کی سیاسی قیادت انبیا کرتے تھے، جب ایک نبی وفات پا جاتا تو دوسرا نبی اس کا خلیفہ بن جاتا۔ بلاشبہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ لیکن عنقریب خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے: لوگوں نے پوچھا: پھر ہمیں آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: (ان میں سے) پہلے کی بیعت کے وفادار رہنا۔ پھر ان کو ان کے حقوق ادا کرنا اور بیشک اللہ ان سے ان کی رعیت کی خبر گیری کے بارے میں پوچھنے والا ہے۔)

۳۰ھ مجموعۂ فتاوی، جلد ۱۰، صفحہ ۳۵۷

۳۱ھ مجموعۂ فتاوی، جلد ۳۵، صفحہ ۲۷

۳۲ھ خلفاء کی مختلف تعداد کا جو حدیث نبوی میں ذکر آیا ہے اس پر بحث کے لیے ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء۔ جلد سوم صفحات ۲۰۱ - ۲۰۷۔ سید موصوف نے بہت سے خلفاء والی حدیث سنن ابی داؤد باب الامامہ اور ابن راہویہ سے نقل کی ہے۔ اس کے بعد "بارہ خلفاء" کی ذیلی سرخی کے تحت صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، سے یہ حدیث نقل کی ہے: "اس وقت تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ اسلامی حکومت اچھی رہے گی جب تک اس پر بارہ آدمی حکومت کریں گے"۔ پھر اسی حدیث کو مختلف الفاظ کے ساتھ صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد کتاب المہدی سے نقل کرکے قاضی عیاض اور حافظ ابن حجر کی تشریحات بیان کی ہیں۔ موخر الذکر کے بارے میں لکھتے ہیں "حافظ ابن حجر ابوداؤد کے الفاظ کی بنا پر خلفاء راشدین اور بنی امیہ میں سے ان بارہ خلفاء کو گناتے ہیں جن کی خلافت پر تمام امت کا اجماع رہا" اس کے بعد انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق سے ہشام بن عبدالملک اموی تک بالترتیب بارہ خلفاء کے نام گنائے ہیں۔ ان میں یزید بن معاویہ کا نام شامل ہے اور مروان بن حکم کا غائب۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آگے صفا۔۹ ۷ پر سید صاحب نے حکومت یزید کے بارے میں ایسی چند حدیثیں اور روایتیں بیان کی ہیں جو اس کو بلائے آسمانی یا قہر الٰہی ثابت کرتی ہیں۔

۳۳ھ صحابہ کرام کی اقتدا کی ہدایت کرنے والی حدیث کے الفاظ ہیں.... اصحابی کالنجوم بأیہم اقتدیتم اهتدیتم.... (میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کروگے راہ ہدایت پاؤگے)۔ ظاہر ہے کہ یہ اتباع و پیروی صدق دلی اور طلب اجر سے کی جائے۔ پھر اگر کوئی صحابی خطائے اجتہادی کا مرتکب بھی ہوتا ہے تو نہ اس صحابی پر کوئی نکیر ہے اور نہ اس کے متبعین پر۔

عدالت صحابہ کے لیے ملاحظہ ہو: مفتی محمد تقی عثمانی، حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق، ص۸-۱۱۴؛ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، ص۳۰۲

۳۴ھ ان جنگوں کی بعض اہم تفصیلات اور فریقین کے مسلک کی تائید و تنقید کے لیے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا محمد اسحاق سندیلوی مولانا سید علی احمد عباسی اور مولانا محمود احمد عباسی وغیرہ کی مذکورہ بالا کتابیں ملاحظہ ہوں۔ نیز ملاحظہ فرمائیے: ابن خلدون، مقدمہ، ص۲۰۶-۲۰۵؛ المنتقیٰ من منہاج الاعتدال، ص۳-۲۲۲ میں امام موصوف کا خیال یہ پیش کیا گیا ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے معاونین کا مقصود اصلاح حال بین المسلمین تھا۔ نیز ملاحظہ ہو ص۵۱-۲۴۹ اور ص۳-۲۶۰ برائے جنگ صفین نیز ملاحظہ ہو: منہاج السنۃ، دوم ص۸-۲۳۶، ص۳۰-۲۴۲ ص۵۱-۲۴۶، ص۱-۲۶۰ وغیرہ۔

۳۵ھ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۱۰، ص۲-۴۳۱۔ نیز ملاحظہ ہو ابن تیمیہ کی العقیدۃ الواسطیہ کی شرح الروضۃ الندیۃ از زید بن عبدالعزیز ریاض ۱۳۷۷ھ، ص۴۴۹

۳۶ھ اس موضوع پر علامہ ابن تیمیہ نے مختلف مقامات پر گفتگو کی ہے۔ ملاحظہ ہو مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۱۰ ص۲-۴۳۱؛ المنتقیٰ من منہاج الاعتدال، ص۲۳۷، ص۳۱۹، ص۳۲۲، ص۳۸۹ وغیرہ؛ منہاج السنۃ، دوم ص۲۶۵ وغیرہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۷۔ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۳۵، ص ۶۶-۵۵؛ المنتقیٰ من منہاج الاعتدال، ص ۲۲-۲۲۱؛ ص ۳-۲۴۱؛ ص ۵۱-۲۴۹؛ ص ۳-۲۶۰، ص ۲۶۵ اور متعدد دوسرے صفحات، منہاج السنۃ، دوم ص ۲-۲۶۰ وغیرہ ص ۸-۲۶۶

۳۸۔ خلافت و ملوکیت، ص ۲-۱۲۰۔ اس کے مخالف اور تنقیدی نقطۂ نظر کے لیے ملاحظہ ہو محمد اسحاق صدیقی سندیلوی، علی احمد عباسی وغیرہ کی کتابیں۔

۳۹-۴۱۔ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۴، ص ۵۲-۴۳۷، ص ۷-۴۶۶؛ جلد ۳۵، ص ۵۱-۵۰، ص ۶-۵۴، ص ۹-۵۸، ص ۶-۶۲، ص ۹-۷۰، المنتقیٰ من منہاج السنۃ النبویۃ، ص ۸-۳۶۴ بالخصوص حاشیہ ۲؛ ص ۸۸-۳۷۹، ص ۲۰۶-۴۰۰ وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو: منہاج السنۃ دوم، ص ۵-۲۶۳؛ ص ۳۱۶ پر امام صاحب نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے: وکذلک الحسن دائما کان یشیر علی ابیہ واخیہ بترک القتال ولما صار الامر الیہ ترک القتال ..... (اسی طرح حضرت حسن اپنے والد اور بھائی کو قتال کو ترک کرنے کے لیے ہمیشہ مشورہ دیتے تھے اور جب زمام کار ان کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے قتال ترک کر دیا۔)

۴۲۔ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۴، ص ۴۶۶؛ المنتقیٰ من منہاج السنۃ، ص ۳۶۳ اور ص ۸-۵۶۶ نیز منہاج السنۃ دوم ص ۶۲-۲۵۹، ص ۶-۲۶۵ وغیرہ دوسرے متعدد صفحات؛ سوم، ص ۱۸۵

۴۳۔ خلافت و ملوکیت، ص ۹۱-۱۸۷؛ حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق، ص ۱۳۳ اور دوسرے صفحات۔

۴۴۔ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۴، ص ۵۲۷؛ المنتقیٰ من منہاج السنۃ، ص ۴-۵۶۳۔ یہ مقولہ حضرت عبداللہ بن مبارک کا ہے جو مشہور محدث و فقیہ تھے۔ ملاحظہ ہو: ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، مطبعہ السعادہ، جلد ہشتم، ص ۱۳۹؛ ان دونوں اموی خلفاء میں حضرت معاویہ کے زیادہ عادل و متقی ہونے کے موازنہ کے لیے ملاحظہ ہو: منہاج السنۃ، سوم ص ۱۸۵

۴۵۔ منہاج السنۃ، سوم ص ۱۸۵ میں حضرت معاویہ کو امام صاحب نے ملوکِ اسلام میں بہترین اور بعد والوں سے بہتر قرار دیا ہے۔ ان کے لیے لفظ مہدی (ہدایت یافتہ) استعمال کیا ہے۔ ان کے حلم و عدل کے بارے میں امام اعمش کا قول نقل کیا ہے کہ لوگ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عدل کی تعریف کر رہے تھے تو حضرت اعمش نے فرمایا کہ کاش تم معاویہ کا عدل دیکھ پاتے۔ امام ابن تیمیہ اور دوسرے مورخین نے ان کے عدل کے متعدد واقعات نقل کیے ہیں۔

۴۶۔ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۳، ص ۱۰-۴۰۹؛ منہاج السنۃ، دوم ص ۱۱-۳۰۹

۴۷۔ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۳، ص ۱۴-۴۰۹، المنتقیٰ من منہاج السنۃ، ص ۳-۴۰۹

© rasailojaraid.com

۴۸ـہ المنتقیٰ من منہاج السنۃ، صفحہ ۲۔۴۱۶ ؛ منہاج السنۃ، دوم صفحہ ۵۔۲۱۳

۴۹ـہ المنتقیٰ من منہاج السنۃ، صفحہ ۲۔۴۲۱ نیز صفحہ ۳۳۔۴۲۴ ؛ منہاج السنۃ، دوم صفحہ ۳۱۶ اور صفحہ ۲۔۳۲۱

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کے سلسلہ میں امام صاحب تین گروہوں کا ذکر کرتے ہیں: اول وہ لوگ جو ان کو باغی اور انتشارِ امت کا مجرم سمجھ کر ان کے قتل کو جائز ٹھہراتے ہیں، دوم جو ان کو معصوم اور واجب الاطاعت امام مانتے ہیں۔ ان دونوں کو متجاوز قرار دے کر امام صاحب کہتے ہیں کہ تیسرا طبقہ جو اہل سنت کا ہے معتدل ہے اور ان کی مظلوم شہادت کا قائل ہے۔

۵۰ـہ مجموعۂ فتاویٰ، جلد ۳۵، صفحہ ۳۵۔۲۱ ؛ نیز جلد ۲۰، صفحہ ۸۔۵۴ ؛ جلد ۳۰ صفحہ ۲۔۲۶۱ نیز جلد ۲۸ صفحہ ۲۔۶۱ وغیرہ ؛ منہاج السنۃ دوم صفحہ ۱۔۳۰۹، صفحہ ۲۔۳۱۱

ادارۂ تحقیق کی مطبوعات کے علاوہ دوسرے مکتبوں کی دینی کتب

بھی آپ ہم سے طلب کرسکتے ہیں۔ بعض کتابوں کے نام یہاں دیے جا رہے ہیں

۱۔ بخاری شریف اردو ترجمہ مکمل ۲ جلدوں میں	۳۰۰/=	۱۴۔ یادِ رفتگاں ماہر القادری	۴۰/=
۲۔ مسلم شریف اردو ترجمہ مکمل ۶ جلدوں میں	۳۰۰/=	۱۵۔ الجہاد فی الاسلام مولانا مودودیؒ	۴۰/=
۳۔ مشکوٰۃ المصابیح ترجمہ مکمل ۳ جلدوں میں	۱۹۵/=	۱۶۔ سیرت سرورِ عالم "	اول ۶۰/= دوم ۸۵/=
۵۔ تذکرہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد	۶۰/=	۱۷۔ معاشیات اسلام "	۲۵/=
۶۔ غبارِ خاطر "	۴۰/=	۱۸۔ سود "	۱۸/=
۷۔ خطبات آزاد "	۵۰/=	۱۹۔ یہودیت و نصرانیت "	۳۰/=
۸۔ مسلمان عورت (ترجمہ) "	۲۰/=	۲۰۔ خلافت و ملوکیت "	۳۰/=
۹۔ عزیمت و دعوت "	۸/=	۲۱۔ معروف و منکر مولانا جلال الدین عمری	۲۵/=
۱۰۔ اصحاب کہف "	۸/=	۲۲۔ خدا اور رسول کا تصور "	۳۰/=
۱۱۔ انتخاب الہلال "	۳۵/=	۲۳۔ عورت اسلامی معاشرے میں "	۲۵/=
۱۲۔ اسلامی فقہ مولانا منہاج الدین مینائیؒ	۷۰/=	۲۴۔ اسلام ایک نظر میں۔ مولانا صدر الدین اصلاحی	۱۵/=
۱۳۔ الرحیق المختوم مولانا صفی الرحمٰن	۱۰۰/=	۲۵۔ زادِ راہ۔ مولانا جلیل احسن ندوی	۳۰/=

ملنے کا پتہ: مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی۔ دودھ پور علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱